ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

قلب - خیر وشر کا مرکز
سید جلال الدین عمری
توریت کا نزول یک بارگی ہوا ہے یا تدریجاً؟
ڈاکٹر محمد مشتاق احمد
بیسویں صدی میں عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقاء
ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
معاشی تحفظ کے لیے نبوی اقدامات
ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس
والدین کے ساتھ حسن سلوک - اسلامی تعلیمات کی روشنی میں
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
مولانا مودودی کے معاشی افکار
ڈاکٹر اوصاف احمد
تعارف وتبصرہ
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
ڈاکٹر محمد شہاب الدین

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ستمبر۲۰۱۲ء

مدیر

سیّد جَلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O.Box: 93,ALIGARH-202002 (INDIA)

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۱ شمارہ: ۳

شعبان المعظم ——— شوال المکرّم ۱۴۳۴ھ

جولائی ——— ستمبر ۲۰۱۲ء

تحقیقاتِ اسلامی کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09582050234

ای میل : tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09897655171

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپے
سالانہ	۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

قلب - خیر وشر کا مرکز	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق وتنقید

توریت کا نزول یک بارگی ہوا ہے یا تدریجاً؟	ڈاکٹر محمد مشتاق احمد	۳۳
بیسویں صدی میں عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی	۵۷

بحث ونظر

معاشی تحفظ کے لیے نبوی اقدامات	ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس	۶۹
والدین کے ساتھ حسن سلوک - اسلامی تعلیمات کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۸۳
مولانا مودودی کے معاشی افکار	ڈاکٹر اوصاف احمد	۱۰۱

تعارف وتبصرہ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور تفسیر مظہری کا تعارف	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۱۱
محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بائبل کی پیشین گوئیاں	،، ،،	۱۱۳
بررسی ادبیات امروز ایران	ڈاکٹر محمد شہاب الدین	۱۱۴
اشاریۂ معارف	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۱۷
خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۴۴)		۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

۲۔ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

ایسوسی ایٹ پروفیسر (عربی) طبیہ کالج، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

چیرمین شعبۂ علوم اسلامیہ، جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد (پاکستان)

۴۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی
معاون مدیر سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ

۵۔ ڈاکٹر اوصاف احمد

سابق افسر بکار خاص، اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، جدہ
ایڈیٹر ششماہی سہولت، نئی دہلی

۶۔ ڈاکٹر محمد شہاب الدین

پروجکٹ فیلو، سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۷۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

حرف آغاز

قلب۔ خیر وشر کا مرکز
(آیاتِ قرآنی کا مطالعہ)

سید جلال الدین عمری

قلب کا لفظ اردو زبان میں دل کے لیے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ یہ عربی لفظ ہے۔ اس کی جمع قلوب ہے۔ قرآن مجید میں اس کا استعمال مجرد یا اضافت کے ساتھ ایک سو بتیس (۱۳۲) مرتبہ ہوا ہے۔ 'قلب' کے لفظی معنی ہیں: حرکت کرنا، الٹ پلٹ کرنا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں کرنا۔[۱]

قلب مستقل حرکت میں ہوتا ہے اور ایک حالت میں نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے قلب کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں قلب کے مادّے اور اس کے مشتقات کا استعمال اس کے لغوی معنی میں متعدد مواقع پر ہوا ہے۔[۲]

قلب کا ہم معنی لفظ 'فواد' ہے۔ اس میں کسی چیز کو پکانے، بریاں کرنے اور بھڑکنے کا تصور ہے۔ دل کو اس کے بھڑکنے کی وجہ سے فواد کہا جاتا ہے۔[۳]

---

[۱] مجد الدین فیروز آبادی کہتے ہیں: قَلَبَہ یَقْلِبُہ حوَّلہ عن وجھہ ... قَلَب الشیء حوَّلہ ظھرًا لبطن ۔ القاموس المحیط، مادہ قلب، ص۱۵۴۔ المعجم الوسیط میں ہے: قلب الشیء قلبا جعل اعلاہ اسفلہ او یمینہ شمالہ او باطنہ ظاھرہ، ص۷۵۲۔

[۲] اس کی دو ایک مثالیں یہاں پیش کی جارہی ہیں۔ لا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ۔ آل عمران:۱۹۶ (تمھیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے ملکوں میں ان لوگوں کی چلت پھرت جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے) سورۂ نور (آیت:۴۴) میں ہے۔ یُقَلِّبُ اللّٰہُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ (اللہ تعالیٰ رات اور دن کو الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے)۔

[۳] صاحب قاموس کہتے ہیں: فاد الخبز جعلہ فی الملۃ . فاد اللحم شواہ ... التفود التحرق والتوقد و منہ الفؤاد للقلب۔ مادہ فاد، ص۳۲۹۔ لسان العرب میں ہے: الفؤاد القلب لتفؤدہ و توقدہ، ج۳، ص۳۲۸، مادہ فأد

قرآن مجید میں قلب کے لیے فؤاد کا لفظ بھی آیا ہے۔سورۂ نجم میں ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (النجم:۱۱) اس نے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا دل نے اسے غلط نہ کہا۔

قرآن میں فؤاد اور اس کی جمع افئدۃ کا استعمال سولہ (۱۶) بار ہوا ہے۔

سمع، بصر اور فؤاد، اللہ کی خاص نعمتیں ہیں۔ان کے ذریعے انسان کو اشیاء کا علم حاصل ہوتا ہے اور وہ صحیح نتائج اخذ کرسکتا ہے۔قرآن میں بار بار توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہاں بعض حوالے دیے جارہے ہیں:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (النحل:۷۸) اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمھیں کان، آنکھ اور دل عطا کیے (اور تم جاننے لگے) تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

سورۂ سجدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، اس کی نسل ایک حقیر پانی (مادۂ منویہ) سے چلائی، اسے نِک سِک سے ٹھیک کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (السجدۃ:۹) اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے۔کم ہی تم شکر ادا کرتے ہو۔

سورۂ ملک میں ہے:

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (الملک:۲۳) (ان سے) کہو کہ وہی ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمھیں کان، آنکھ اور دل دیے۔کم ہی تم شکر ادا کرتے ہو۔

یہی آیت سورۃ المومنون میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ آئی ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (المومنون:۷۸) وہی ذات ہے جس نے تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے (لیکن) تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے یہ ذرائعِ علم اس لیے عطا کیے ہیں کہ اس کے احسان کا اعتراف ہو، آدمی کا سر جذبۂ شکر سے جھک جائے اور ان کا صحیح استعمال ہو۔ یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ ان کے غلط استعمال پر اللہ کے ہاں باز پرس بھی ہوگی:

وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُلاً○ (الاسراء:۳۶)

اور اس چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کا تمھیں علم نہیں ہے۔ بے شک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک سے باز پرس ہوگی۔

جس بات سے آدمی کو صحیح واقفیت نہ ہو اس کے پیچھے پڑنا اور اس پر عمل کرنا اخلاقی جرم ہے، اس سے معاشرے پر برے اثرات پڑتے ہیں۔ اس سے جھوٹ، افترا پردازی، تہمت اور جھوٹی گواہی جیسی خرابیوں کی راہ کھلتی ہے۔ بغیر تحقیق کے جو بات کہی جائے گی اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

قلب کی طبعی اہمیت

ہمارے جسم میں دل بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسے اعضاء رئیسہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہمارا دل ایک لمحہ کے لیے بھی رُکے بغیر رات دن حرکت کرتا رہتا ہے اور خون کو صاف کر کے پورے جسم میں پہنچاتا اور اسے توانائی فراہم کرتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسان کی زندگی قائم ہے۔ اس کی حرکت میں ذرا بھی فرق آجائے تو زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ اس کی حرکت بند ہوجائے تو انسان کو موت کی آغوش میں پہنچنے سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ اس لیے ہر انسان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کا دل ٹھیک طریقہ سے اپنا فرض انجام دیتا رہے۔

دل سے حیاتِ روحانی کا تعلق

ایک اور پہلو سے دیکھئے تو دل غلط اور صحیح افکار و جذبات کی آماج گاہ ہے۔ اس سے انسان کی حیاتِ جسمانی ہی نہیں حیاتِ روحانی بھی وابستہ ہے۔ قرآن مجید دل کا اسی رُخ سے ذکر کرتا ہے۔ اس نے اس بات پر تنقید کی ہے کہ آدمی دل سے صحیح کام نہ لے اور اندھا بہرا بن کر غلط راستے پر چل پڑے۔ خدا کے منکرین و مشرکین یہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس نے

کہا کہ غفلت کی یہ زندگی جانوروں سے بدتر زندگی ہے اور آخرت کو تباہ کرنے والی ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (الاعراف:۱۷۹)

جنوں اور انسانوں میں سے بہت سے وہ ہیں، جن کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں، لیکن وہ ان سے نہیں سمجھتے۔ ان کی آنکھیں ہیں، لیکن وہ ان سے نہیں دیکھتے اور ان کے کان ہیں، لیکن ان سے وہ نہیں سنتے۔ یہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے زیادہ بھٹکے ہوئے۔ یہ وہ ہیں، جو غفلت میں پڑے ہیں۔

دل انسان کے فکر و عمل کا رخ متعین کرتا ہے۔ اسی کے ذریعے وہ جنت یا جہنم کا مستحق ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ جہنم میں اس وجہ سے جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیت دی انھوں نے اس کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ اسی لیے فرمایا: ''ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔'' اس کی وجہ یہ بیان کی: ''لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا'' (اللہ نے ان کو دل دیے، لیکن اس سے وہ غور و فکر اور سوجھ بوجھ کا کام نہیں لے رہے ہیں۔) انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کو کس نے پیدا کیا؟ اگر اللہ نے پیدا کیا ہے تو وہ ان سے کیا چاہتا ہے؟ انہیں دنیا میں کیسی زندگی گزارنی چاہیے؟ کیا یہ زندگی یوں ہی ختم ہو جائے گی یا اس کے بعد بھی کوئی زندگی ہے؟ جہاں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے؟ انہوں نے یہ سوچ کر زندگی گزار دی کہ اس دنیا سے آگے کچھ نہیں ہے۔ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس کے بعد فرمایا: ''وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا'' (وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ہیں۔) اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں اور وہ اندھے ہو گئے ہیں، بلکہ وہ نگاہِ حقیقت بین سے محروم ہیں۔ وہ دنیا کو مادّی راحت و آسائش کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھانے، لذت یاب ہونے اور جذبات کو تسکین دینے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ان کی علم و تحقیق اور تگ و دو اسی کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے قدرت کی کارفرمائی انہیں نظر نہیں آتی۔ وہ دیکھنے کے باوجود حقیقت میں نہیں دیکھتے۔ ان کے بارے

میں کہا گیا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (یوسف:۱۰۵)

کتنی ہی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں، ان پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے لیکن وہ ان سے بے رخی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

قرآن چاہتا ہے کہ آدمی اس کائنات کو دیکھے تو اس کے خالق و مالک کو پہچاننے کی کوشش کرے، اس سے قربت کی راہ اختیار کرے، اس کی اطاعت وفرماں برداری کا جذبہ اس کے اندر پیدا ہو، لیکن افسوس کہ اللہ نے انھیں آنکھیں دیں، لیکن اس سے وہ یہ کام نہیں لے رہے ہیں:

آگے فرمایا: 'وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا' (ان کے کان ہیں، لیکن وہ ان سے سنتے نہیں ہیں) ان کے سامنے اللہ کے پیغمبر، ان کے جانشین، ہر دور کے صالح اور خدا ترس بندے اللہ کا دین اور اس کی تعلیمات پیش کرتے ہیں، لیکن وہ انہیں سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ کوئی تبلیغ، کوئی تذکیر اور کوئی وعظ ونصیحت انہیں حق کی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ وہ بہرے کانوں سے سنتے ہیں اور اندھی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا: "اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ" (یہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گم راہ اور یہ وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہیں۔)

جو لوگ دل و دماغ سے کام نہیں لیتے، دیکھنے میں تو جانوروں سے وہ مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کا قد سیدھا ہے، چار پیر کی جگہ دو پیر سے چلتے ہیں، ہاتھوں سے چیزوں کو پکڑتے اور استعمال کرتے ہیں۔ بے زبان نہیں، منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ لیکن ذہن ومزاج اور رویہ کے لحاظ سے جانور ہی ہیں۔ جانور کو زندہ رہنے، کھانے پینے اور جنسی خواہش کی تکمیل اور نسل کشی سے آگے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی ان ہی چیزوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: 'بَلْ هُمْ اَضَلُّ' (بلکہ وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں)۔ اس لیے کہ جانور کو عقل نہیں ہے، لیکن یہ باعقل و باخرد جانور ہیں۔ جانور سے قیامت میں باز پرس نہ ہوگی کہ اس نے کیا دیکھا، کیا نہیں دیکھا، قلب و دماغ سے کام لیا یا نہیں لیا، لیکن انسان کو ان سوالات کا سامنا کرنا پڑے

گا۔اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

دنیا میں بڑی بڑی زور آور اور طاقت ور قومیں پائی گئیں۔جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کی مخالفت کی اور ان کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا وہ تباہ ہوگئیں۔ان کی مادّی ترقی اور شان و شوکت انہیں بچا نہ سکی۔قرآن کہتا ہے: جو لوگ دل و دماغ سے محروم ہیں وہ اسے گردشِ دوراں یا تاریخ کے لازمی تقاضوں کے طور پر دیکھتے ہیں، اس سے جو نصیحت حاصل کرنا چاہیے نہیں حاصل کرتے:

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ○ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○ (الحج:۴۵،۴۶)

کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، اس لیے کہ انہوں نے ظلم کا راستہ اختیار کیا۔ یہ اپنی چھتوں کے ساتھ الٹی پڑی ہیں، کنویں بیکار ہیں (کوئی ان کا استعمال کرنے والا نہیں) اور مضبوط قلعے ہیں جو کھنڈر بن گئے ہیں۔کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ہوتے جس سے وہ سوچتے یا کان ہوتے جن سے سنتے۔حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اصل اہمیت انسان کے قلب کی ہے۔دل اندھا ہے تو آنکھیں بھی بصیرت سے محروم ہوجاتی ہیں اور انسان گوشِ ہوش بھی کھو بیٹھتا ہے۔

قلب۔خیالات و جذبات کا مرکز

انسان کے قلب ہی میں صحیح یا غلط افکار اور جذباتِ عمل پرورش پاتے ہیں۔اسی میں توحیدِ خالص کا عقیدہ جاگزیں ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کا جذبہ ابھرتا اور تقویٰ و طہارت کا رجحان نشو ونما پاتا ہے۔قلب ہی میں صداقت، دیانت و امانت، عفت و عصمت، ہمدردی، اخلاص و خیر خواہی جیسی اعلیٰ اخلاقیات کی تخم ریزی ہوتی ہے اور وہ برگ و بار لاتی ہیں۔ قلب ہی میں کفر، شرک، خدا بے زاری اور معصیت جگہ پاتی ہے۔اسی میں نفاق،

ریاکاری، جھوٹ، نفرت وعداوت، بغض وحسد، شقاوت اور سنگ دلی، عریانی اور بے حیائی جیسے سفلی جذبات ابھرتے ہیں۔

قرآن مجید میں بعض اعمال کو صراحت کے ساتھ قلب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہاں ان ہی کے حوالوں سے گفتگو کی جائے گی۔

کفر وشرک اور طبعِ قلب

قرآن مجید نے کفر وشرک کے رویہ اور اس کے اسباب ومحرکات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں کہا گیا کہ یہ کتاب ہدایت ہے، لیکن جن لوگوں نے کفر ہی پر قائم رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے ان کے حق میں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے انذار کی سعی و جہد اور کفر کے نتائج سے آگاہ کرنا کارگر نہ ہوگا۔ وہ کسی حال میں ایمان نہیں لائیں گے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (البقرۃ:۷)	اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں، ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

دل پر جب مہر لگ جاتی ہے تو آدمی حق کو سننے اور اسے سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا اور کائنات میں موجود دلائل پر غور نہیں کرتا۔ اس سے ہدایت وضلالت کے معاملہ میں قلب کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس آیت کے ذیل میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے:

فیہ دلیل علی فضل القلب علی جمیع الجوارح ... فالقلب موضع الفکر[1]	اس میں تمام اعضاء پر قلب کی برتری کی دلیل ہے.....قلب غور وفکر کی جگہ اور محل ہے۔

طبعِ قلب کا مفہوم

قرآن مجید میں 'طبعِ قلب' (دل پر مہر لگانے) کا ذکر مختلف مناسبتوں سے آیا ہے۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے کہ اس نے دل پر مہر لگادی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل پر مہر لگادی، اس لیے قبولِ حق کا امکان نہیں رہا، بلکہ اس میں اللہ کا قانون

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۱، جزء ۱، ص ۱۳۱

بیان ہوا ہے کہ آدمی کفر وشرک پر اصرار کرے، غلط روی سے باز نہ آئے اور اصلاحِ حال کے لیے آمادہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے، زبردستی اس کے دل کی دنیا نہیں بدلتا اور اپنی قوتِ قاہرہ سے کھینچ کر اسے سیدھے راستے پر نہیں لگاتا۔

قرآن مجید میں یہ بات اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ دل پر کب مہر لگ جاتی ہے؟ یہود کے متعلق کہا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول ماننے کے باوجود وہ انہیں ہر طرح اذیت دینے لگے۔ ان کی اس غلط روش کے نتیجے میں ان کے دل راہ راست سے پھیر دیے گئے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لاَ يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (الصّف:۵)

جب انھوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یعنی یہود کی کج روی کی وجہ سے اللہ نے ان کے دل راہ راست سے پھیر دیے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قانون بھی بیان کر دیا گیا کہ جو لوگ فسق و فجور ہی کی راہ پر چلنا چاہیں اللہ انھیں ہدایت سے نہیں نوازتا۔

منافقین کے بارے میں ارشاد ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لاَ يَفْقَهُوْنَ○ (المنفقون:۳)

یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے، پھر کفر کیا۔ اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ پس وہ نہیں سمجھیں گے۔

منافقین نے دعویٰ ایمان کے باوجود کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔ اس پر وہ ثابت قدم رہنا چاہتے ہیں اور اس کے عواقب و نتائج پر غور کرنے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہیں۔ ان کے اس غلط رویہ کی وجہ سے ان کے دل پر مہر لگ گئی ہے۔ کوئی بات سمجھنے کے لیے انھوں نے دل و دماغ کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

آدمی اگر سب کچھ جاننے کے باوجود خواہشِ نفس کو خدا بنا بیٹھے اور اس کے پیچھے سرپٹ دوڑنے لگے تو حق بات سننے کے لیے کان اور اسے قبول کرنے کے لیے دل آمادہ نہیں

ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کی بنیاد پر اس کی سماعت پر اور دل و دماغ پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ کوئی اسے راہ ہدایت نہیں دکھا سکتا:

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ○ (الجاثیۃ:۲۳)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش (نفس) کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے اپنے علم کی بنیاد پر اسے گم رہی میں ڈال دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ پھر کون ہے اللہ کے بعد جو اسے راستہ دکھائے، تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے۔

فرعون اور آلِ فرعون کے درمیان ایک مردِ مومن کی تقریر قرآن میں تفصیل سے نقل ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کبر و غرور اور اپنی بڑائی کے نشے میں بے دلیل خدا کی ہدایت کا انکار کیا جانے لگتا ہے تو خدا کا غضب بھڑک اٹھتا ہے اور دل پر مہر لگ جاتی ہے:

اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (المؤمن:۳۵)

بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں میں بغیر کسی دلیل اور سند کے جو ان کے پاس موجود ہو، جھگڑا کرتے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک اور ایمان والوں کے نزدیک سخت غصہ کے مستحق ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

یہود کی پوری تاریخ ان کی غلط کاریوں کی تاریخ ہے۔ اس کا ایک ورق اس طرح کھولا گیا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا○ (النساء:۱۵۵)

انھوں نے جو عہد و پیمان کیا تھا اس کو توڑنے، اللہ کی آیات کا انکار کرنے، انبیاء کو ناحق قتل کرنے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (ان پر اللہ کا عتاب ہوا) حقیقت یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ وہ کم ہی ایمان لائیں گے۔

قرآن مجید میں دل پر مہر لگنے کے لیے یہ تعبیر بھی اختیار کی گئی ہے کہ دل پر پردے پڑ

گئے ہیں۔سورۂ انعام میں مشرکین کے متعلق کہا گیا کہ وہ بہ ظاہر تمھاری باتیں سننے پر کبھی کان لگاتے ہیں، لیکن حقیقتاً وہ نہیں سنتے، ان کے دلوں پر پردے پڑے ہیں۔ وہ اسے نہیں سمجھیں گے اور اسے داستان سرائی کہہ کر رد کردیں گے:

وَ مِنۡهُمۡ مَنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ۚ وَ جَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَ اِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝

(الانعام:۲۵)

ان میں سے بعض تمھاری بات کان لگا کر سنتے ہیں (لیکن حق کو قبول کرنے کے ارادے سے نہیں) ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال رکھی ہے۔ وہ ہر ایک نشانی دیکھ لیں، تب بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ جب جھگڑا کرنے کے لیے تمھارے پاس آئیں گے تو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ کہیں گے کہ یہ تو اگلوں کی داستانیں ہیں۔

حق کے دلائل واضح ہونے اور تذکیر و نصیحت کے بعد بھی آدمی انکار کی روش اختیار کرے اور اس کے انجام کو دیکھنے کے لیے آمادہ نہ ہو تو دل کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور کان صدائے حق سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسے ظالموں کے متعلق کہا گیا:

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعۡرَضَ عَنۡهَا وَ نَسِىَ مَا قَدَّمَتۡ يَدَاهُ ؕ اِنَّا جَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَّ اِنۡ تَدۡعُهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى فَلَنۡ يَّهۡتَدُوۡۤا اِذًا اَبَدًا ۝ (الکہف:۵۷)

اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی گئی اور اس نے ان سے اعراض کرلیا اور اس کے دونوں ہاتھوں نے جو آگے بھیجا ہے اسے بھول گیا، ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی ہے۔ اگر تو ان کو راہِ راست کی طرف بلائے تو وہ کبھی راہ نہیں پائیں گے۔

اوپر کی آیات میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ دل پر مہر کب لگتی ہے اور پردے کب پڑتے ہیں؟ ہدایت سے محرومی کے اسباب کیا ہیں؟

اہلِ ایمان کے قلوب کا حال

اس کے برخلاف ایمان دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو انسان کی زندگی پر اس کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ وہ اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرنے لگتا ہے۔ اِس کردار سے انسان پر راہِ ہدایت مزید کھلتی چلی جاتی ہے:

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ (التغابن:۱۱)

جو تکلیف بھی پہنچتی ہے اللہ کے حکم ہی سے پہنچتی ہے۔ جس کا اللہ پر ایمان ہو، اللہ اس کے قلب کو ہدایت سے نوازتا ہے۔ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

اللہ کے ان نیک بندوں کا، جو اس کے گھر آباد رکھتے ہیں، ذکر ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ یَخَافُوْنَ یَوْماً تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ○ (النور:۳۷)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور لین دین، اللہ کے ذکر سے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتے۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں، جس میں دل اور نگاہیں الٹ پلٹ جائیں گے۔

ایک جگہ فرمایا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے اس کے دشمنوں سے محبت اور رازداری کا تعلق رکھیں، چاہے وہ ان کے ماں باپ اور اولاد ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے:

اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ وَ یُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (المجادلۃ:۲۲)

یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح (غیبی طاقت) سے ان کی مدد کی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ اللہ کا گروہ ہیں۔ سن رکھو اللہ کا گروہ ہی فلاح یاب ہے۔

وہ اس بات کی دعا کرتے رہتے ہیں کہ راہِ راست ملنے کے بعد دل غلط رخ نہ اختیار

کر لے اور وہ آخرت میں اللہ کے عذاب سے محفوظ رہیں:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ رَبَّنَا اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○
(آل عمران:۸،۹)

اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو، جب کہ تو نے ہمیں ہدایت سے نوازا ہے، راہِ راست سے نہ پھیر دے اور اپنے پاس سے رحمت سے نواز دے۔ بے شک تو ہی سب کچھ بخشنے والا ہے۔ اے ہمارے رب بے شک تو اس دن (قیامت) تمام لوگوں کو جمع کرنے والا ہے، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

یہ دو تصویریں ہیں۔ ایک طرف غلط روی پر اصرار ہے، دلائل سے اعراض اور بے توجہی ہے، اللہ سے کیے گئے عہد و پیمان کی پامالی ہے، جو اللہ کے غضب کو دعوت دیتی اور انسان کو ہدایت سے محروم کر دیتی ہے۔ دوسری طرف اللہ کا خوف اور خشیت ہے، اس کے دین سے محبت اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ ہے، جو انسان کو ہدایت کا مستحق بناتا ہے۔

نفاق کا مرض

نفاق ایک خطرناک مرض ہے۔ یہ ایمان کی ضد ہے۔ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ جس دل میں نفاق ہوگا وہ ایمان سے خالی ہوگا اور جہاں ایمانِ خالص ہوگا وہ نفاق سے پاک ہوگا۔ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں منافقین کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ وہ اپنی چرب زبانی سے اہل ایمان کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالاں کہ وہ خود فریب خوردہ ہیں۔ اہل ایمان کے درمیان اپنے ایمان کا چرچا کرتے ہیں، لیکن اپنے حلقے میں پہنچتے ہیں تو انھیں اپنی دوستی کا یقین دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان والوں سے مذاق کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل قرآن میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اس پستیِ کردار کی وجہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○
(البقرۃ:۱۰)

ان کے دلوں میں روگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روگ میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس جھوٹ کی بنا پر جو وہ بولتے ہیں۔

ان کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے اور اسے چھپانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا۔

حقیقی ایمان

اس کے برخلاف حقیقی ایمان خدا اور رسول پر یقینِ کامل کا نام ہے، جو ہر شائبہ شک و تردد سے پاک ہوتا ہے۔ اس کی پہچان ہی یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی آسان ہو جاتی ہے۔ (الحجرات: ۱۵)

نفاق کو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے دین سے بیر ہوتا ہے، لیکن ایمان سے اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ ایک جگہ اصحابِ رسول ﷺ کی تعریف کی گئی ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ ۝ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (الحجرات: ۷، ۸)

لیکن اللہ نے تمھیں ایمان کی محبت دی، اس سے تمھارے دلوں کو آراستہ کیا، کفر، فسق اور معصیت سے تمھارے اندر نفرت پیدا کر دی۔ ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ یہ سب اللہ کا فضل اور انعام ہے۔ اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

نفاق کی ایک پہچان نازک مواقع پر خوف اور ہراسانی ہے۔ جب آزمائش کا مرحلہ سامنے ہوتا ہے تو منافق اس سے بچنے کی تدبیر سوچنے لگتا ہے۔ وہ جرأت و ہمت کے مظاہرے کی جگہ اپنی بزدلی کی توجیہ کرنے لگتا ہے۔ اسے اپنی اصلاح کی فکر تو نہیں ہوتی، البتہ دوسروں کی کمزوریاں تلاش کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ جنگِ احد میں مسلمانوں کو فتح و نصرت کے بعد بعض لوگوں کی غفلت کی وجہ سے شکست سے دوچار ہونا پڑا اور بڑا جانی نقصان بھی ہوا۔ اسے اہلِ ایمان نے اللہ کا فیصلہ سمجھا اور نئے عزم و ہمت سے پیش قدمی جاری رکھی، لیکن منافقین کہنے لگے:

هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَىْءٍ ... لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ مَا قُتِلْنَا هٰهُنَا

کیا ہمارا اس معاملہ میں کوئی اختیار ہے؟ (ہماری تو کوئی نہیں سنتا)... اگر معاملات میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا کہ موت کا جو وقت طے ہے اور جہاں موت آنی ہے اسی وقت اور اسی جگہ موت آئے گی۔تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو تب بھی موت تمھیں باہر کھینچ لائے گی۔دراصل اس واقعہ میں تمھارا امتحان ہے:

وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (آل عمران:۱۵۴)

(یہ اس لیے ہوا) تاکہ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس کی آزمائش کرے اور جو کچھ تمھارے سینوں میں کھوٹ ہے اسے باہر نکال دے اور اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔

نازک مواقع پر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو سکونِ قلب سے نوازتا اور ان کے ایمان و یقین میں اضافہ فرماتا ہے۔صلح حدیبیہ کو قرآن نے 'فتح مبین' قرار دیا ہے، اس لیے کہ اس کے بعد دین کی کامیابی کی راہیں کھل گئیں۔یہ صلح جن حالات میں ہوئی اس پر بعض اہل ایمان کو بھی تردد تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جلد ہی انہیں سکون اور اطمینان عطا فرمایا کہ یہ صلح اللہ کے دین کے حق میں مفید ہے:

هُوَ الَّذِيْ اَنزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْا اِيْمَاناً مَّعَ اِيْمَانِهِمْ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْماً حَكِيْماً ○ (الفتح:۴)

وہی ذات ہے جس نے سکون نازل فرمایا اہل ایمان کے قلوب میں، تاکہ ان کے اندر جو ایمان ہے اس میں مزید اضافہ ہوجائے۔اور اللہ ہی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کے لشکر۔اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مادی وسائل اور افرادی طاقت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔اس کی بنیاد پر جو قومیں دوسروں پر برتری چاہتی ہیں، وہ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔زمین اور آسمان کے سارے لشکر اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔وہ جسے چاہتا ہے غلبہ و اقتدار عطا کرتا ہے۔

قساوتِ قلب

قرآن مجید کی عظمت کا بیان سورۂ حشر میں ان الفاظ میں ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ (الحشر:۲۱)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے جھک گیا ہے اور پھٹ پڑا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور وفکر کریں۔

مطلب یہ کہ پہاڑ کو انسان کی طرح عقل وخرد ہوتی، اسے آزادی فکر وعمل سے نوازا جاتا، قرآن کے احکام کا مکلّف بنایا جاتا اور اس کے انجامِ نیک و بد سے آگاہ کیا جاتا تو اس کی بلندی ختم ہو جاتی، وہ خوف سے جھک جاتا اور پارہ پارہ ہو جاتا، لیکن یہی قرآن انسان سے خطاب کر رہا ہے اور وہ اس سے اثر نہیں قبول کر رہا ہے، اس کی قساوت نہیں جاتی۔ اس میں غور و فکر کا بڑا سامان ہے۔

یہود کی قساوتِ قلب کا قرآن میں مختلف مواقع پر ذکر ہے اور وہ اسباب بھی بیان کر دیے گئے ہیں، جن سے یہ قساوت پیدا ہوتی ہے۔ ایک جگہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کے لیے تمھارے اندر آمادگی نہیں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گائے ذبح کرنے کے لیے کہا تو تم نے طرح طرح کے سوالات شروع کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے مردے کو زندہ کر کے تمھارے سامنے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا، تا کہ تمھارے اندر زندگی بعد موت پر یقین پیدا ہو، لیکن اس کے باوجود تمھیں ایمان کی دولت نصیب نہ ہوئی اور تمھارے دل سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (البقرۃ:۷۴)

پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے۔ وہ پتھر کے مانند ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ بعض پتھر تو وہ ہیں، جن سے نہریں بہتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو شق ہو جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلنے لگتا ہے اور بعض وہ ہیں جو اللہ کی خشیت سے گر پڑتے ہیں اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

یہاں تین طرح کے پتھروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض پتھر وہ ہوتے ہیں جن سے

نہریں رواں ہوتی ہیں اور دنیا ان سے سیراب ہوتی ہے۔ بعض پتھروں سے تھوڑا بہت پانی نکلتا ہے اور اس سے اسی قدر فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ بعض پتھر اس طرح کارآمد نہیں ہوتے، لیکن ان میں اللہ کا خوف ہوتا ہے اس سے وہ گر پڑتے ہیں۔ اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تم اپنی افادیت کھو چکے ہو، تم سے کسی بڑے فائدے کی کیا توقع کی جائے، تھوڑا سا فائدہ بھی نہیں پہنچ رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمھارے قلوب اللہ کے خوف اور خشیت سے بھی خالی ہو چکے ہیں۔

یہود نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد وفا باندھا تھا اسے توڑ دیا، اس وجہ سے وہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیے گئے، ان کے دل سخت ہوگئے، ان کے لیے ہر غلط کام کا کرنا آسان ہوگیا۔ اپنے حقیر مفادات کے لیے وہ اللہ کی کتاب میں تحریف تک کر رہے ہیں اور اس کی تعلیمات کو فراموش کر بیٹھے ہیں:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً. يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (المائدۃ:۱۳)

ان کے نقضِ میثاق کی وجہ سے ان پر ہم نے لعنت کردی (اپنی رحمت سے دور کر دیا) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلام کو اپنے موقع محل سے پھیر دیتے ہیں اور جن باتوں کی ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک بڑا حصہ فراموش کر چکے ہیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا: اللہ کی کتاب یہود کے پاس تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسے انھوں نے پس پشت ڈال دیا، اس کی وجہ سے دل سخت ہوگئے۔ اللہ کی کتاب دل میں نرمی اور گداز پیدا کرتی ہے۔ اس کو چھوڑنے کے بعد قساوتِ قلب کیسے دور ہوسکتی ہے؟ اور آدمی فسق وفجور سے کیسے باز رہ سکتا ہے؟ مسلمانوں کو یہ روش اختیار کرنے سے منع کیا گیا:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ ○ (الحدید:۱۶)

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دلوں میں اللہ کے ذکر سے اور جو حق نازل ہوا ہے اس سے خشوع پیدا ہو اور وہ ان لوگوں کی روش نہ اختیار کریں، جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی اور ان پر ایک مدت گزر گئی (ان میں خشوع نہیں پیدا ہوا) اور ان کے دل سخت ہوگئے۔ ان میں سے بیشتر فاسق ہیں۔

جب قومیں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو فراموش کر دیتی ہیں تو ان پر اس کا عذاب آتا ہے۔ وہ معیشت کی تنگی، فقر و فاقہ اور طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف پلٹیں اور اپنی روش پر نادم اور شرم سار ہوں، لیکن قساوتِ قلب کی وجہ سے انہیں رجوع الی اللہ نصیب نہیں ہوتا اور شیطان انھیں یہ باور کرا دیتا ہے کہ یہ سب گردش ایام ہے، جس روش پر وہ گامزن ہیں وہ صحیح ہے:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِکَ فَاَخَذْنَاھُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّھُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ ○ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَ ھُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ○

(الانعام:۴۲،۴۳)

ہم نے تم سے پہلے دوسری قوموں میں بھی رسول بھیجے (جب انھوں نے ان کی بات نہ مانی تو) ہم نے ان کو فقر و فاقے اور بیماریوں میں پکڑ لیا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ ہم نے ان کی گرفت کی تو انھوں نے کیوں نہیں عاجزی اختیار کی؟ لیکن ان کے دل سخت ہوگئے اور جو کچھ وہ کر رہے تھے شیطان نے اسے انہیں آراستہ کر کے دکھا دیا تھا۔

اس طرح کی قومیں تذکیر و تنبیہ کے باوجود اگر اپنی روش سے باز نہ آئیں تو ان کی آزمائش دوسری طرح سے ہونے لگتی ہے۔ ان پر ہر طرح کے عیش و عشرت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ جب وہ اس میں مست و مگن ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ان کی داستان ختم ہو جاتی ہے:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

(الانعام:۴۵)

پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کی راہ اختیار کی۔ شکر ہے اللہ کا جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔

یہ سب قساوتِ قلب کا نتیجہ ہے۔ لیکن مومن کا قلب اس سے پاک ہوتا ہے۔ اللہ کے منکرین اور مخالفین کے سامنے اس کا کلام پیش کیا جاتا ہے تو اسے وہ اندھے اور بہرے بن کر سنتے ہیں، ان کی نخوت اسے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے، لیکن اہل ایمان کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَ عُمْيَاناً○ (الفرقان:۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو ان کے رب کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو اس پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں پر اس کا خاص انعام ہوتا ہے، وہ ان کو ہدایت سے نوازتا اور کارِ نبوت کے لیے ان کا انتخاب فرماتا ہے۔ سورۂ مریم میں بعض پیغمبروں کے ذکر کے بعد ان کے جذبات اور قلبی کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِن ذُرِّيَّةِ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْرَائِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّداً وَبُكِيّاً○ السجدة (مریم:۵۸)

یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی ذریت میں سے اور ان میں سے جن کو نوح کے ساتھ ہم نے کشتی میں سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے، جن کو ہم نے ہدایت دی اور رسالت کے لیے منتخب کیا۔ جب ان کو رحمان کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے۔

قرآن مجید نے منکرینِ اہلِ کتاب اور مشرکین سے کہا کہ تم اللہ کی اس کتاب کا انکار کر رہے ہو اور اس پر اڑے ہوئے ہو۔ دوسری طرف اہل کتاب کے اہل علم ہیں کہ وہ اس کتاب کو سنتے ہیں تو اللہ کی حمد وثنا کرتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں اور ان کے خشوع وخضوع میں اضافہ ہو جاتا ہے:

قُلْ آمِنُواْ بِهِ أَوْ لاَ تُؤْمِنُواْ إِنَّ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْعِلْمَ مِن قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلأَذْقَانِ سُجَّداً○ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولاً○ وَيَخِرُّونَ لِلأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوعا○ السجدة (بنی اسرائیل:۱۰۹)

کہو تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ۔ بے شک وہ لوگ جن کو اس سے پہلے (توریت کا) علم دیا گیا ہے جب ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں (چہرے) کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب۔ بے شک ہمارے رب کا وعدہ (آخری کتاب نازل کرنے کا) پورا ہونا ہی تھا۔ اور وہ روتے ہوئے چہروں کے بل گر پڑتے ہیں اور ان کے خشوع میں اضافہ ہوتا ہے۔

قساوتِ قلب انسان کو حق سے دور کرتی ہے اور قلب کا خشوع وخضوع اللہ تعالیٰ سے قریب کرتا ہے۔ یہی اللہ کے نیک بندوں کی پہچان ہے۔

انقباضِ قلب

دل کی ایک بیماری حق سے انقباض ہے یہ انقباض آدمی کو اللہ تعالیٰ کو ماننے، توحید کا راستہ اختیار کرنے اور اس کی اطاعت وفرماں برداری کرنے نہیں دیتا۔ اللہ واحد کے ذکر ہی سے اس کے اندر نفرت اور تکدر ابھر آتا ہے۔ چناں چہ مشرکین کے بارے میں کہا گیا:

وَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُونَ بِالْاٰخِرَةِ وَ اِذَا ذُکِرَ الَّذِیْنَ مِن دُوْنِهٖ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُونَ○ (الزمر:۴۵)

جب اللہ واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دلوں پر انقباض طاری ہونے لگتا ہے۔ جب اس کے سوا دوسروں (جھوٹے خداؤں) کا ذکر ہوتا ہے فوراً خوش ہوجاتے ہیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کے جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے جنہیں خدا اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ذکر ہی سے وہ گھٹن محسوس کرنے لگتے ہیں اور ان کے دل بھنچنے لگتے ہیں۔ اس کی جگہ جب معبودانِ باطل کا تذکرہ ہوتا ہے تو ان کے اندر فرحت و انبساط کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سورہ بنی اسرائیل میں کفار ومشرکین کی اس کیفیت کا ذکر کسی قدر تفصیل سے ہے:

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرآنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لاَ یُؤْمِنُونَ بِالآخِرَةِ حِجَاباً مَّسْتُوراً○ وَ جَعَلْنَا عَلَی قُلُوبِهِمْ أَکِنَّةً أَن یَفْقَهُوهُ وَفِیْ آذَانِهِمْ وَقْراً وَإِذَا ذَکَرْتَ رَبَّکَ فِیْ الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَی اَدْبَارِهِمْ نُفُوراً○ (بنی اسرائیل:۴۵-۴۶)

جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان ایک پوشیدہ حجاب ڈال دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں کہ وہ اسے سمجھ نہ پائیں اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دیتے ہیں۔ جب تم قرآن میں اپنے رب کا ذکر کرتے ہو جو ایک ہے تو وہ نفرت سے پیٹھ پھیر کر پلٹ جاتے ہیں۔

شرحِ صدر

انقباضِ قلب کی ضد ہے شرحِ صدر۔ اللہ تعالیٰ جس کسی کو سیدھا راستہ دکھانا چاہتا ہے اس پر اسے شرحِ صدر حاصل ہوتا ہے۔ اس کے اندر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ اللہ کے ہر حکم کو بجا لانے کے لیے خوشی سے آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ ضلالت اور گم راہی میں پڑا رہے تو اس کے سینہ کے دروازے اطاعت کے لیے نہیں کھلتے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زور لگا کر آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے اور اس کی جان نکلی جا رہی ہے۔ ان دونوں کیفیات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ○

(الانعام:۱۲۵)

اللہ جس شخص کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے وہ گم راہی میں ڈالنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے، قبول حق کے لیے اس میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، جیسے وہ مشکل سے آسمان پر چڑھ رہا ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ کے دین پر شرح صدر ہونا ہدایت کی علامت ہے اور جو اس نعمت سے محروم ہے وہ ضلالت اور گم رہی کا شکار ہے۔ یہی بات دوسری جگہ ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ○

(الزمر:۲۲)

پس کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی عطا کردہ روشنی پر قائم ہے (اس شخص کی طرح ہے جو قساوت قلب میں مبتلا ہے) پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل سخت ہیں اور اللہ کے ذکر کا اثر نہیں قبول کرتے۔ یہ لوگ کھلی گمرہی میں ہیں۔

دل اثر پذیر بھی ہے

انسان کا قلب اس کے اعمال کا مرکز ومحور ہے۔ اسی سے حرکت وعمل کا جذبہ اسے ملتا ہے، اس کے ساتھ انسان کے اعمال خود بھی قلب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آدمی کا پاکیزہ کردار اور حسنِ سیرت اس کے قلب کو جلا عطا کرتی ہے۔ اس کی غلط روی اور بدعملی سے دل پر ظلمت چھاجاتی ہے۔[1]

قرآن مجید کے منکرین اسے ماضی کی داستان کہا کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ قصے کہانیوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی کتاب ہے جو ان کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔ ان کے انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی بدعملیوں کی وجہ سے ان کے قلوب زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ حق کی روشنی ان پر منعکس نہیں ہو رہی ہے اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہو گئے ہیں:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (المطففين:۱۴)

ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے ان کی بداعمالی کی وجہ سے جس کا وہ ارتکاب کر رہے تھے۔

احادیث میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ غلط اعمال سے دل پر آہستہ آہستہ زنگ آنے لگتا ہے۔ اسے صیقل نہ کیا جائے تو پورا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج توبہ و استغفار اور اپنی غلط روش کو بدلنا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس سلسلے کی متعدد روایات ابن جریر، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد کے حوالے سے نقل کی ہیں۔ نسائی کی روایت کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان العبد اذا اخطأ خطيئة نكت فى قلبه نكتة سوداء فان هو نزع و استغفر و تاب صقل قلبه و ان عاد زيد

جب بندہ کوئی غلطی کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ دھبہ آ جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے کنارہ کش ہو جائے، استغفار اور توبہ کرے تو دل صیقل ہو جاتا ہے، لیکن وہ دوبارہ یہی عمل

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۱، جزء ۱، ص ۱۳۴

فیھا حتی یعلو قلبه فھو الران الذی ذکر اللہ[1]

کرے تو یہ دھبہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے۔ یہی وہ 'ران' (زنگ) ہے، جس کا اللہ نے ذکر کیا ہے۔

قلب سلیم

قرآن مجید میں اس قلب کی تعریف کی گئی ہے، جس میں پاکیزہ جذبات پرورش پارہے ہوں اور جو روحِ اخلاص سے معمور ہو۔ اسے 'قلب سلیم' کہا گیا ہے۔ یہی قلبِ سلیم قیامت میں انسان کو کامیابی سے ہم کنار کرے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا کے بعض کلمات یہ ہیں:

وَ لَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ○ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ○ (الشعراء:۸۷-۸۹)

اور مجھے اس دن رسوا نہ فرما جس دن سارے انسان اٹھائے جائیں گے، جس دن مال نفع دے گا اور نہ اولاد، صرف وہی کامیاب ہوگا جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر حاضر ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسی 'قلب سلیم' سے نوازا تھا۔ ارشاد ہے:

وَ اِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ ○ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ○ (الصّٰفّٰت:۸۳،۸۴)

بے شک نوح ہی کی راہ پر چلنے والا ابراہیم تھا، جب وہ اپنے رب کے پاس 'قلب سلیم' لے کر حاضر ہوا۔

'قلب سلیم' سے مراد وہ قلب ہے جو کفر وشرک کی آلائشوں سے پاک ہو، جس سے ایمان و یقین کے سوتے پھوٹ رہے ہوں، جس میں کسی طرح کے شک اور تردد کا گزر نہ ہو، جس میں اللہ سے محبت و اخلاص، اس کی اطاعت اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ موج زن ہو اور جو اس کے ہر

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳۱۹/۸، ۳۲۰۔ یہ حدیث الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الدعوات، باب الاستغفار والتوبۃ میں مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔ اس میں بندے کی جگہ مومن کا لفظ ہے۔

حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہو، جو ان تمام جذبات واحساسات کو دبا دے جو معصیت کی طرف لے جاتے ہیں۔

قلب کا تقویٰ

سورۃ الحج میں 'شعائر اللہ' (دین کی نمایاں محسوس علامتیں) کی تعظیم کا ذکر ہے اور اسے قلب کے تقویٰ کی دلیل قرار دیا گیا ہے:

وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ○ (الحج:۳۲) — جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کی علامت ہے۔

یہ بات حج کے سلسلے میں کہی گئی ہے۔ یہاں 'شعائر اللہ' سے مراد وہ مخصوص مقامات ہیں جہاں مناسک حج ادا کیے جاتے ہیں۔ چناں چہ صفا و مروہ کی پہاڑیوں کو 'شعائر اللہ' کہا گیا ہے (البقرۃ:۱۵۹)۔ اس میں طواف، سعی، وقوف، رمی اور قربانی کے مقامات بھی آتے ہیں۔ ان کی تعظیم سے مراد یہ ہے کہ ان کی عظمت محسوس کی جائے، دل سے ان کا احترام ہو اور ان مقامات پر شریعت کے حکم کے مطابق مناسک ادا کیے جائیں۔ حج کے موقعے پر ہدی یا قربانی کے جانور کا شمار بھی شعائر اللہ میں ہوتا ہے۔ (الحج:۳۶) اس کا احترام ضروری ہے۔ اب وہ ایک عام جانور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے نسبت نے اسے خاص احترام عطا کیا ہے۔ قربانی کے متعلق ارشاد ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَاءُ هَا وَ لٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ (الحج:۳۷) — اللہ کے پاس نہ ان کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ خون۔ اس کے پاس تو تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

قربانی ایک ظاہری عمل ہے، اس کی روح تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی کو دیکھتا ہے۔ قربانی کا گوشت پوست اور خون یہیں رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پاکیزہ جذبہ کو قبول کرتا ہے جس کا نام تقویٰ ہے۔ یہ بات شریعت کے تمام احکام کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر ہی کو نہیں اس کی حقیقی روح تقویٰ کو دیکھتا ہے۔ اور تقویٰ کا مسکن انسان کا قلب ہے۔

اصلاح قلب کی اہمیت

انسان کے صلاح وفساد میں فیصلہ کن اہمیت قلب کو حاصل ہے۔قلب کی اصلاح پر پوری زندگی کی اصلاح کا دارومدار ہے۔قلب میں بگاڑ ہےتو آدمی کو غلط رخ پر جانے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں قلب کی اس اہمیت کو بہت واضح اور موثر طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت ہے، جو بخاری، مسلم اور حدیث کی بعض دیگر کتابوں میں موجود ہے، کہتے ہیں:

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الحلال بَیِّنٌ و الحرام بَیِّنٌ و بینھما مشتبھات لاَ یعلمھن کثیر من الناس فمن اتقی الشبھات استبرا لدینہ و عرضہ و من وقع فی الشبھات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمٰی یوشک ان یرتع فیہ اَلاَ و ان لکل ملک حمی الا و ان حمی اللہ محارمہ الا و ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب[1]

میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے۔ان کے درمیان مشتبہات بھی ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔اس لیے جو شخص شبہات سے بچے وہ اپنے دین اور عزت کو بچالے جائے گا اور جو شبہات میں پڑے وہ حرام ہیں پڑ سکتا ہے۔اس کی مثال چرواہے کی ہے، جو کسی محفوظ چراگاہ کے اطراف اپنے جانور چراتا ہے۔اندیشہ ہے کہ جانور اس کے اندر چرنے لگے۔سن رکھو! ہر بادشاہ کی ایک خاص چراگاہ ہوتی ہے۔اللہ کی خاص چراگاہ اس کے محارم ہیں (اس میں داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہیں ہے) یاد رکھو! جسم میں گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔وہ درست ہو تو پورا جسم درست ہوتا ہے اور اس میں خرابی آجائے تو پورے جسم میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔سن رکھو یہ قلب ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ۔مسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔ الفاظ مسلم کے ہیں۔اس حدیث کو محدثین نے ان تین چار احادیث میں شمار کیا ہے، جن پر اسلام کی کل تعلیمات کی اساس ہے۔نووی، شرح مسلم، جلد۶، جزء۱۱، ص۲۳

اس حدیث میں احکام شریعت کی نوعیت بیان کی گئی ہے۔ فرمایا گیا کہ جو چیزیں حلال یا حرام ہیں وہ واضح ہیں۔ ان کے حق میں نصوص اور واضح دلائل موجود ہیں۔ ان کے بارے میں شریعت کا موقف آسانی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ان کے درمیان مشتبہ امور بھی ہیں، ان کا حکم معلوم کرنا ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہے۔ اسلامی علوم کے ماہرین ہی کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ حلت کی کوئی بنیاد ہوگی تو اسے حلال قرار دیں گے اور حرمت کے اسباب ہوں گے تو حرمت کا فیصلہ کریں گے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی بتادی گئی کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کی چیزوں سے احتراز کیا جائے۔ اس سے آدمی کا دین بھی محفوظ رہے گا اور اس پر یہ الزام بھی عائد نہ ہوگا کہ اس نے مادی فائدہ کی خاطر غلط کام کیا ہے۔ شبہات سے بچنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں پڑنے کے بعد آدمی آہستہ آہستہ حرام کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ اس کی مثال آپ نے یہ دی کہ اگر کوئی چرواہا اپنے جانور دوسرے کی چراگاہ کے قریب چرائے تو اس میں وہ کسی وقت گھس ہی جائیں گے۔ جس طرح ہر بادشاہ کی مخصوص چراگاہ ہوتی ہے، اسی طرح اللہ کے محارم اس کی خاص چراگاہ ہیں۔ اس میں داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ آدمی ان محارم سے بچنا چاہے تو اسے ان سے دور ہی رہنا ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے اصلاحِ قلب کی طرف جن الفاظ میں توجہ دلائی انہیں ادب اور اخلاق کا شاہ پارہ کہا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: جسم میں گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے، لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر وہ درست ہے تو سارا جسم درست رہے گا، اس میں فساد آجائے تو پورا جسم مبتلائے فساد ہوجائے گا۔ یہ انسان کا قلب ہے۔

جسم میں قلب کی حیثیت حاکم کی ہے۔ اس کے حکم پر اعضاء حرکت کرتے ہیں۔ اس میں جذبہ صلاح ہو تو پورا جسم صحیح راہ پر گامزن ہوگا، اس میں فاسد جذبات پرورش پا رہے ہوں تو جسم اسی رخ پر چل پڑے گا۔ اگر قلب غلط جذبات سے پاک ہو تو وہ محرمات سے اور مشتبہ چیزوں سے بچے گا، ورنہ وہ حرام کا ارتکاب بھی کرسکتا ہے اور مشتبہ امور سے دور رہنا بھی اس کے لیے مشکل ہوگا۔

قلب تغیر پذیر ہے

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں انسان کی حیات ہے۔اس میں پیچھے رہ جانے کے بعد وہ حیوانوں کی زندگی تو بسر کرسکتا ہے لیکن حقیقی زندگی سے محروم ہوگا۔اس لیے فرمایا گیا کہ اللہ اور رسول جب تمھیں کسی بھی معاملہ میں آواز دیں تو فوراً دوڑ پڑو۔اس میں جان بھی چلی جائے تو یہ تمھارے لیے باعث حیات ہے۔اس میں پس وپیش کروگے تو یاد رکھو دل کا حال بدل سکتا ہے۔ اللہ تمھارے اور تمھارے دل کے درمیان حائل ہوجائے گا اور تم پیچھے چلتے چلے جاؤ گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُم لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَ اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَاَنَّهٗ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○ (الانفال:۲۴)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمھیں بلا رہا ہے اس چیز کی طرف جو تمھارے لیے حیات ہے۔ یہ بات سمجھ لو کہ انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ حائل ہو جاتا ہے اور اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے۔

حقیقت یہ ہے کہ قلب مستقل ایک حال میں نہیں رہتا، اس کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دل کی مثال بیاباں میں ایک پر کی ہے، ہوائیں اسے ادھر ادھر کرتی رہتی ہیں۔[1]

دل کی اس کیفیت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی بہ کثرت دعا ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے دین پر ثابت رکھے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ اکثر دعا فرمایا کرتے تھے:

یا مقلب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینک

اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر جما دے۔

---

[1] ابن ماجہ: المقدمہ، باب ۱۰، مسند احمد، ۴/ ۴۰۸

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: آپ کو تو ثباتِ قلب حاصل ہے۔ آپ پر اور آپ کی تعلیمات پر ہمارا ایمان ہے۔ کیا ہمارے متعلق آپ کو اندیشہ ہے؟ آپ نے فرمایا:

نعم القلوب بين اصبعين من اصابع الله يقلبها كيف يشاء [1]

ہاں! انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ وہ ان کو جیسا چاہتا ہے الٹ پھیر کرتا رہتا ہے۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان قلوب بني آدم كلها بين اصبعين من اصابع الرحمن كقلب واحد يصرفه كيف يشاء

تمام بنی آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان اسی طرح ہیں جیسے ایک دل دو انگلیوں کے درمیان ہو اور وہ اسے جیسے چاہے پھیرے۔

اس کے بعد دعا فرمائی:

اللهم مصرف القلوب صرف قلوبنا على طاعتك [2]

اے اللہ دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔

اس سے اللہ کی اطاعت کی طرف دل کے متوجہ رہنے اور دین پر استقامت کے لیے دعا کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہ دعا ہمیشہ ہوتی رہنی چاہیے۔

☆☆☆

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب فی القدر بحوالہ ترمذی وابن ماجہ

[2] مسلم، کتاب القدر، باب تصریف اللہ القلوب کیف یشاء

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کی چند اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱	معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۳۷	۹۰
۲	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۳	مشترکہ خاندانی نظام اور نظریہ اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۴۰
۴	وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۵	آزادئ فکر و نظر اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۶	قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۷	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۵۰
۸	اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۸۴	۴۵
۹	کفر اور کافر قرآن کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۶۰	۲۰
۱۰	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲۲۴	۵۰
۱۱	مسلمانوں کی حقیقی تصویر	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۶۴	۵۵
۱۲	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۳	شیئر بازار میں سرمایہ کاری	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۱۵۶	۴۵

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

تحقیق وتنقید

تورات کا نزول یک بارگی ہوا ہے یا تدریجاً ؟

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

تورات کے متعلق مسلمان اہل علم نے (بہ استثنائے چند) بالعموم یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ پوری کی پوری بہ یک وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ یہ بھی مان لیا گیا ہے کہ یہ واقعہ کوہِ طور پر ہوا، جب فرعون کی غرقابی کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا اور آپ وہاں چالیس دن مقیم رہے، پھر آپ کو تورات پوری کی پوری الواح پر لکھی ہوئی دے دی گئی۔[۱] یہی وجہ ہے کہ مسلمان اہل علم کی توجہ اس بات پر تو ہوتی ہے کہ تورات پر کون کون سے حوادث گزرے اور اس میں کس کس طرح تحریف ہوتی رہی؟ لیکن اس کی تدوین کے مسئلے پر بالعموم وہ سکوت اختیار کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے متعلق یہ مان لینے کے باوجود کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف ٹکڑوں کی صورت میں نازل ہوا، مسلمان اہل علم نے کیوں یہ فرض کر لیا ہے کہ تورات کا نزول یک بارگی ہوا؟ اس سلسلے میں جو دلائل دیے جاتے ہیں ان کا سطور ذیل میں جائزہ لیا جاتا ہے:

نَزَّلَ اور أَنْزَلَ کا فرق

قرآن کریم کی دو آیات میں قرآن کے لیے نزّل اور تورات کے لیے انزل کا استعمال ہوا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے:

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيْلَ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ۔ (آل عمران: ۳-۴)	اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو اس سے پہلے تھی۔ اور اس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر۔ اور پھر فرقان اتارا۔

اسی طرح سورۃ النسآء میں ارشاد باری ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّـذِيْنَ آمَنُواْ آمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتـٰبِ الَّـذِىْ نَـزَّلَ عَـلَـى رَسُولِهِ وَالْكِتـٰبِ الَّذِىَ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۔ (النسآء:۱۳۶)

اے ایمان والو! ایمان لے آؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری، اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔

نزّل باب تنزیل سے ہے اور أنزل باب انزال سے۔ دونوں کا استعمال اتارنے کے مفہوم میں ہوتا ہے، لیکن ان میں کیا فرق ہے؟ اس کے متعلق علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

و التعبير بأنزل فيهما للاشارة الى انه لم يكن لهما الا نزول واحد ، وهذا بخلاف القرآن، فان له نزولين، نزول من اللوح المحفوظ الى بيت العزة من سماء الدنيا جملة واحدة، و نزول من ذلك اليه صلى الله عليه و سلم منجما فى ثلاث و عشرين سنة على المشهور، و لهٰذا يقال فيه : نزّل وأنزل ۔[۲]

ان دونوں (تورات اور انجیل) کے لئے أنزل کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ ان دونوں کے لئے، قرآن کے برعکس، بس ایک ہی نزول تھا، جب کہ قرآن کے لیے دو نزول تھے، ایک نزول لوح محفوظ سے سماء دنیا میں بیت العزۃ تک یک بارگی ہوا، اور دوسرا نزول وہاں سے رسول اللہ ﷺ پر مشہور قول کے مطابق تیئس سال کے عرصے میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے لئے دونوں الفاظ استعمال ہوتے ہیں: نزّل بھی اور أنزل بھی۔

یہ استدلال کئی وجوہ سے ضعیف ہے:

اولاً: أَنْزَلَ اور نَزَّلَ دونوں الفاظ کا استعمال قرآن کے لیے بھی ہوا ہے اور تورات کے لیے بھی۔ تورات کے لیے لفظ نزّل کے استعمال کی مثال سورۃ آل عمران کی درج ذیل آیت ہے:

كُـلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِـلاًّ لِّبَنِىْ إِسْرَائِيْلَ إِلاَّ مَـا حَرَّمَ إِسْرَائِيْلُ عَلَى نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۔ (آل عمران:۹۳)

کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں، مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام ٹھہرالی تھیں۔

ثانیاً: یہ دلیل محتاج ثبوت ہے کہ نَزَّلَ کا استعمال بہ تدریج نزول اور أَنْزَلَ کا استعمال یک بارگی نزول کے لئے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن کی متعدد آیتوں میں اس کے یک بارگی نزول کے مفہوم کے لیے لفظ أَنْزَلَ کے بجائے لفظ نَزَّلَ کا استعمال کیا گیا ہے، مثلاً

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً۔ (الفرقان:۳۲)

اور ان کافروں نے کہا کہ اس (رسول) کے اوپر پورا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیا گیا؟

وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَاباً نَّقْرَؤُهُ۔ (بنی اسرائیل:۹۳)

اور ہم تمہارے (آسمان پر) چڑھنے کو بھی ماننے کے نہیں جب تک تم (وہاں سے) ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جسے ہم پڑھیں۔

علامہ آلوسی نے اس اشکال کا ذکر کیا ہے، پھر یہ تاویل اختیار کی ہے:

و ذكر بعض المحققين لهذا المقام ان التدريج ليس هو التكثير ، بل الفعل شيئاً فشيئاً، كما فى تسلسل، و الالفاظ لابد فيه من ذلك، فصيغة (نزّل) تدل عليه، و (الانزال) مطلق، لكنه اذا قامت القرينة يراد بالتدريج التنجيم، وبالانزال الذى قوبل به خلافه ، اوالمطلق بحسب ما يقتضيه المقام۔[۳]

اس مقام کے ذیل میں بعض محققین نے ذکر کیا ہے کہ تدریج تکثیر کا مترادف نہیں ہے، بلکہ تدریج کسی کام کو درجہ بدرجہ کرنے کو کہتے ہیں، جیسا کہ تسلسل میں ہوتا ہے، اور الفاظ میں ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ پس نزّل کا صیغہ اس (درجہ بدرجہ اتارنے) پر دلالت کرتا ہے، جب کہ انزال کا صیغہ مطلق ہے۔ تاہم جب قرینہ ہو تو تدریج سے تنجیم (تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا) مراد لی جاسکتی ہے، اور جب انزال اس کے مقابل استعمال ہو تو مراد تنجیم کا عکس (یک بارگی نزول) بھی ہوسکتا ہے اور موقع کلام کی مناسبت سے اس سے مراد مطلقاً نزول بھی ہوسکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض انزال اور تنزیل کے فرق سے تورات کا یک بارگی نزول ثابت نہیں ہوتا۔

نزّل اور أنزل میں فرق کے متعلق لسان العرب میں یہ تحقیق کی گئی ہے:

تنزّله و أنزله و نزّله بمعنى. قال سيبويه : و كان ابو عمرو يفرق بين نزّلت و أنزلت، و لم يذكر وجه الفرق. قال ابوا الحسن: لا فرق عندى بين نزّلت و أنزلت الا صيغة التكثير فى نزّلت. فى قراء ة ابن مسعود: و أنزل الملئكة تنزيلا ؛ أنزل: كنزّل [۴]

تنزّلہ و أنزلہ و نزّلہ کا مفہوم ایک ہی ہے۔سیبویہ کا کہنا ہے کہ ابوعمرو نزّلت اور أنزلت میں فرق کرتے تھے، تاہم انہوں نے فرق کی وضاحت نہیں کی۔ابوالحسن کا قول ہے کہ: میرے نزدیک نزّلت اور أنزلت میں کوئی فرق نہیں، سوائے اس کے کہ نزّلت کا صیغہ تکثیر پر بھی دلالت کرتا ہے۔حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت میں ہے: وأنزل الملٰئكة تنزيلا ؛ أنزل: كنزّل۔

ہماری رائے میں یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ یہ دونوں الفاظ مطلقاً اتارنے کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔تاہم علامہ آلوسی کا بیان کردہ یہ اصول بھی صحیح ہے کہ یہ الفاظ جب مقابل کے طور پر استعمال ہوں تو عربیت کے مسلّمہ اسلوب کی رو سے ان کے مفہوم میں کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ان الفاظ کے استعمال پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا استعمال مجرد اتارنے کے مفہوم میں بھی ہوا ہے، تاہم قرینے کی موجودگی میں لفظ تنزیل خصوصی اہتمام کے ساتھ اتارنے کے مفہوم پر بھی دلالت کرتا ہے۔مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ ان الفاظ میں کیا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُون ۔ (الحجر:۹)

یقیناً یہ یاددہانی ہم نے ہی اتاری ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

یہاں ایک تو جمع متکلم جلالی صیغہ ہے، پھر اِنَّ اور لام کی تاکید در تاکید بھی ہے، پھر جمع متکلم کے ضمیر منفصل نے مزید تاکید کے علاوہ حصر کا بھی مفہوم پیدا کر دیا ہے، پھر قرآن کے لئے لفظ 'الذکر' کے استعمال نے اس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔موقعِ کلام، اسلوب اور لہجہ سبھی کچھ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ 'تنزیل' سے یہاں محض اتارنا ہی نہیں، بلکہ خصوصی اہتمام

سے اتارنا مراد ہے۔ اس خصوصی اہتمام کا ایک مظہر یہ ہے کہ یہ اتارنا ایک خاص حکمت، انداز ے اور منصوبے کے مطابق ہوتا ہے۔ (اس مفہوم کی وضاحت کے لئے ملاحظہ کیجئے الشوریٰ: ۲۷، الحجر: ۲۱) اسی بنا پر جب قرآن مجید کے اتارنے کے سلسلے میں خصوصی اہتمام اور حکمتوں پر زور دینا مقصود ہو تو لفظ تنزیل کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً معاندین یہود کو رسول کی مخالفت پر وعید سناتے ہوئے کہا گیا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتٰبَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُم ۔(النسآء: ۴۷)

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی! اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو تمہارے پاس ہے۔

اس خصوصی اہتمام ہی کا ایک مظہر بہ تدریج اتارنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُرْآناً فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيْلاً۔ (بنی اسرائیل: ۱۰۶)

اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لئے اتارا کہ تم اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ، اور ہم نے اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔

یہاں سیاق کلام یہ ہے کہ مشرکین مکہ نے یہودِ مدینہ کی ایما پر مختلف قسم کے معجزات دکھانے کا مطالبہ کیا تو انہیں جواب دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے قرآن مجید نازل کیا ہے، جس میں ان کو تمام حقائق کھول کھول کر بتا دیے گئے ہیں۔ جو لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، بلکہ ایمان لانے کے لئے مختلف قسم کے مطالبات پیش کرتے ہیں، انہیں اگر معجزات دکھا بھی دیے گئے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بنی اسرائیل، جو یہ مطالبات تمھیں سکھاتے ہیں، انہی سے پوچھ لو کہ فرعون کو ایک دو نہیں بلکہ نو معجزات دکھائے گئے لیکن اسے ایمان نہیں لانا تھا نہیں لایا۔ اس کے بعد اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ سچا کلام ہے، اس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے، اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو رسول کو اس کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ رسول کا کام تو بس انذار اور تبشیر ہی ہے۔ اسی مقصد کی خاطر قرآن کریم ٹکڑوں میں نازل کیا جا رہا ہے، تاکہ لوگ اس کے پیغام کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کے پاس نہ ماننے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

قرینے کی موجودگی کی صورت میں لفظ أنـــزل بھی اہتمام اور تفخیم شان پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً:

وَأَنـزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ ۔(المؤمنون:۱۸) اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازے کے ساتھ، پس اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔

جب یہ دونوں الفاظ ایک جملے میں ایک دوسرے کے مقابل کے طور پر استعمال ہوں تو ایسے واقع پر ایک احتمال یہ ہوتا ہے کہ تنزیل اہتمام پر دلالت کے لئے لایا گیا ہو۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اسلوب میں ندرت اور تنوع پیدا کرنے کے لئے ہو، جو بلیغ کلام کی ایک نشانی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے پہلے احتمال کو اختیار کیا ہے[۵] لیکن ہمارے نزدیک دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے۔ مولانا اصلاحی نزولِ قرآن کے سلسلے میں خصوصی اہتمام کی ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن مجید کے زمانۂ نزول میں جنات کی آسمانوں تک رسائی روک دی گئی اور ان پر شہابِ ثاقب کے حملوں میں شدت آ گئی۔ چنانچہ جنات نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسی قسم کا اہتمام تورات کے لئے نہیں ہوا تھا۔ آخر کیوں نہ ہوا ہو؟ کیا تورات نازل کرتے وقت اسے جنات اور شیاطین کی ملاوٹ سے محفوظ رکھنا ضروری نہیں تھا؟ اس کے علاوہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر قرآن مجید اور پچھلی کتابوں کے اتارنے کا ذکر ایک ہی جملے میں آیا ہے، لیکن ان دو مقامات کے ماسوا باقی تمام مقامات پر دونوں کے لئے انـــزال ہی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ کیجیے البقرۃ:۴، آل عمران:۱۹۹، النساء:۶۰ وغیرہ)

اس تفصیل سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ أنـــزل اور نـــزّل کے درمیان فرق سے تورات کے یک بارگی نزول پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

کیا پوری تورات الواح پر لکھ کر دی گئی تھی؟

تورات کے یک بارگی نزول کے لیے ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر الواح دی گئی تھیں، جن میں تورات لکھی ہوئی تھی۔ سورۃ الاعراف میں

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔ (الاعراف: ۱۴۵)

اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

استاد محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی اس سلسلے میں کہتے ہیں:

''قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمانے کا ارادہ کیا تو ان کے ایک ماہ کے اعتکاف کے بعد ان کو پوری کی پوری تورات تختیوں کی شکل میں لکھی ہوئی دے دی۔''[۶]

یہ استدلال کئی وجوہ سے محل نظر ہے:

اولاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ان الواح کے دیے جانے سے پہلے اور ان کے بعد بھی وحی کا نزول ہوتا رہا اور آپ وہ وحی لکھتے رہے۔ اس بات کے قطعی شواہد قرآن مجید اور اسفار خمسہ سے آگے دیے جائیں گے۔

ثانیاً: یہ بات بھی متنازعہ ہے کہ الواح پر پوری تورات دی گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''سورہ اعراف (آیات: ۱۵۰۔۱۵۴) میں جہاں نزولِ تورات کا ذکر ہے وہاں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تورات ایک دو نہیں، بلکہ بہت سی تختیوں پر لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی۔ ہدایت اور رحمت پر مبنی یہ نسخۂ کیمیا ان تختیوں پر لکھا ہوا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سینا سے لے کر آئے تھے۔ بعض اہل علم نے اس امکان کا اظہار بھی کیا ہے کہ طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پوری تورات کے بجائے صرف احکام عشرہ عطا فرمائے گئے تھے۔ اس ضمن میں یہ اہل علم موجودہ تورات کے رائج الوقت تراجم میں موجود اسلوب بیان سے استدلال کرتے ہیں۔ اگر یہ استدلال تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ احکام عشرہ پر مبنی بہت سی الواح کے بجائے کوئی چھوٹی سی لوح ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی ہوگی۔ اس لئے کہ احکام عشرہ چند سطروں سے زائد نہیں ہیں اور ان کو لکھنے کے لئے ایک

چھوٹی سی تختی ہی کافی ہے۔قرآن مجید میں واضح طور پر الواح (بصیغۂ جمع) کا ذکر ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تختیاں محض احکام عشرہ پر مبنی نہیں تھیں، بلکہ ان میں وہ پوری ہدایت الٰہی اور رحمت خداوندی موجود تھی جو تورات کا طرہ امتیاز تھی۔(وَ فِی نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ)۔''ے

یہودی اور عیسائی علما کا موقف یہ ہے کہ ان احکام میں حقوق اللہ سے تعلق رکھنے والے احکام ایک تختی پر اور حقوق العباد سے متعلق احکام دوسری تختی پر درج کیے گئے تھے۔قرآن و حدیث کے اشارات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔اس بنا پر یہ بات باوزن نہیں ہے کہ یہ احکام تو چند ہی سطروں پر مشتمل ہیں اور ان کے لکھنے کے لئے ایک چھوٹی سی تختی بھی کافی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن تختیوں پر یہ احکام لکھے گئے ان کے سائز کے متعلق کوئی قابل اعتماد روایت دستیاب نہیں ہے۔اس لئے ان کے سائز کے متعلق کچھ کہنا محض ظن وتخمین پر ہی مبنی ہوگا۔اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے احکام کا نسبتاً بڑے حروف میں لکھا جانا ہی زیادہ مناسب تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات اہم ہے کہ قرآن مجید نے 'لوحین' (تثنیہ) کے بجائے 'الواح' (جمع) کا صیغہ استعمال کیا ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پوری تورات بیک وقت لکھ کر دے دی گئی تھی۔اس کی ایک سادہ توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ جس طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری لمحات میں بنی اسرائیل کے تمام قبائل کے لئے اللہ تعالیٰ کے قانون کی نقلیں تیار کر کے ان کو دے دیں اور ایک نسخہ بنی لاوی کے سپرد کر دیا، جسے 'عہد کے صندوق' (Ark of the Covenant) میں رکھ دیا گیا۸، اسی طرح ان دو تختیوں کی کئی نقلیں دیگر تختیوں پر لکھ دی گئی تھیں، جو انہوں نے بنی اسرائیل کے ہر قبیلے کو دے دیں۔

قرآن مجید کے الفاظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تختیوں پر احکام خدا نے لکھ کر دیے۔تاہم بعض احادیث میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ذکر کی گئی ہے کہ انہیں خدا نے تختیوں پر احکام 'اپنے ہاتھ سے لکھ کر' دیے۔۹ کتاب خروج میں دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔۱۰ان متعارض روایات کی ایک توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ دو تختیوں پر تو خدا نے خود ہی احکام لکھ کر ان کو دیے، پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس کی نقلیں دیگر تختیوں پر ہر قبیلے

کے لئے تیار کیں۔

سورۃ الاعراف کی آیت (وَ فِی نُسۡخَتِهَا هُدًى وَّرَحۡمَةٌ) سے بھی یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ تورات پوری کی پوری یک بارگی دے دی گئی تھی، کیونکہ ہدایت اور رحمت جس طرح پوری تورات کی خصوصیت تھی اسی طرح اس کے اجزا کی بھی خصوصیت تھی۔ قرآن مجید نے اپنی بھی یہی خصوصیت ذکر کی ہے۔ (ملاحظہ ہو- الانعام: ۱۵۷، لقمان: ۳)

کیا یہود وحی الٰہی کے تھوڑا تھوڑا نازل کیے جانے کے اسلوب سے مانوس نہ تھے؟

ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اپنے مقالہ میں قرآن مجید کے تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی متعدد حکمتیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بدلتے ہوئے نئے حالات میں مناسب رہ نمائی ملتی رہے، دوسری حکمت یہ کہ تلقی وحی ایک نہایت غیر معمولی تجربہ ہے۔ اس کو یک بارگی حاصل کر لینا کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔[۱۱] ظاہر ہے کہ یہی کچھ تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ایک بات یہ بھی لکھی ہے:

''مزید برآں یہودِ یثرب کے اشارے پر کفارِ مکہ کا قرآن مجید کے یک بارگی نازل نہ کیے جانے پر اعتراض سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی وحی الٰہی کے نجماً نجماً نازل کیے جانے والے اسلوب سے مانوس نہ تھے۔ ان کے لئے مانوس اور مالوف اسلوب کتابِ الٰہی کو یک بارگی نازل کیے جانے ہی کا تھا، ورنہ وہ یہ اعتراض کبھی نہ کرتے۔''[۱۲]

یہ دلیل بھی نا قابل تسلیم ہے، کیونکہ:

اولاً: یہ بات محل نظر ہے کہ مشرکین نے یہ اعتراض یہود کے اشارے پر کیا تھا۔ قرآن مجید میں مشرکین کے متعدد اعتراضات ایسے نقل کیے گئے ہیں جو یہود کے سکھائے ہوئے تھے، مگر وہاں کوئی نہ کوئی قرینہ پایا جاتا ہے، جس سے اس کی تعیین ہو جاتی ہے (مثلاً ملاحظہ کیجیے الانعام: ۹۱، بنی اسرائیل: ۱۰۱) مگر جہاں قرآن کریم نے مشرکین مکہ کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن نجماً نجماً کیوں نازل کیا گیا وہاں کوئی قرینہ ایسا نہیں پایا جاتا جس سے معلوم ہو کہ یہ

اعتراض یہود کا القا کیا ہوا تھا۔

ثانیاً: اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ اعتراض یہود کا بتایا ہوا تھا تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ وحی کے منجّماً نزول سے واقف یا اس سے مانوس نہیں تھے۔ وہ تو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں بہت سی ایسی باتوں کا انکار کرتے تھے جو ان کے مسلّمات تھے۔

ثالثاً: یہود کے صحائف اس بات کی سب سے بڑی شہادت دیتے ہیں کہ وہ وحی کے منجماً نزول کے اسلوب سے بخوبی واقف تھے۔ تورات اور دیگر صحائف انبیاء میں اس امر کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں۔ بلکہ وہاں تو یہ تک لکھا ہوا ملتا ہے کہ یہ کلام فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو نازل ہوا، پھر اس کے بعد فلاں تاریخ کو یہ کلام نازل ہوا۔ مثلاً کتاب حزقیال کی بالکل ابتدا میں آتا ہے:

''تیسویں برس کے چوتھے مہینے کی پانچویں تاریخ کو یہ ہوا کہ جب میں نہر کبار کے کنارے پر اسیروں کے درمیان تھا تو آسمان کھل گیا اور میں نے خدا کی رویتیں دیکھیں۔''[۱۳]

اسی طرح مختلف مواقع پر نزول وحی کا تذکرہ اس صحیفے میں ہے:

''پھر نویں برس کے دسویں مہینے کی دسویں تاریخ کو خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا۔''[۱۴]

کتابِ حجّی میں مذکور ہے:

''ساتویں مہینے کی اکتیسویں تاریخ کو خداوند کا کلام حجّی نبی کی معرفت پہنچا۔''[۱۵]

''اور دارا بادشاہ کی سلطنت کے دوسرے سال کے نویں مہینے کی چوبیسویں تاریخ کو خداوند کا کلام حجّی نبی کی معرفت پہنچا۔''[۱۶]

''پھر اسی مہینے کی چوبیسویں تاریخ کو خداوند کا کلام حجّی نبی پر نازل ہوا۔''[۱۷]

ان انبیاء پر مختلف اوقات میں نازل ہونے والی وحی الٰہی اب ان کے نام منسوب صحائف میں ایک جگہ اکٹھی ملتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ روایات بذات خود صحیح ہیں یا نہیں، ان سے کم از کم یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ بنی اسرائیل کلام الٰہی کے منجماً نزول کے اسلوب سے مانوس تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا نقطۂ نظر

مولانا امین احسن اصلاحی ابتدا میں اس کے قائل تھے کہ تورات پوری کی پوری یک بارگی نازل ہوئی تھی۔ اپنے اس موقف کا تفصیلی اظہار انھوں نے اپنی کتاب 'مبادئ تدبر قرآن' میں کیا ہے۔ قرآن کے مقصد نزول سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے لفظ 'حکمت' کی لغوی تشریح بہت تفصیل سے کی ہے۔ آخر میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''قرآن تورات کی طرح صرف قانون ہی نہیں ہے، بلکہ انجیل کی طرح اس میں حکمت و موعظت بھی ہے۔ کتاب اور حکمت کا یہی مجموعہ ہے جس کو ہم قرآن کے نام سے جانتے ہیں۔ چونکہ یہ کامل حکمت سے معمور ہے، اس وجہ سے اس میں کمال و عرفان کی وہ تمام بجلیاں بھی بند ہیں جن کی ایک ادنی نمود نے طور کو پاش پاش اور حضرت موسی علیہ السلام کو بے ہوش کر دیا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہوئی اس نے ایک ایسے انسان کو پیدا کیا جس نے وہ بوجھ اٹھا لیا جو طور برداشت نہ کر سکا تھا۔ یہی راز ہے کہ تورات کا بہ یک دفعہ نازل ہونا تو ممکن ہوا، لیکن قرآن حکیم بہ یک دفعہ نہیں، بلکہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوا، تاکہ قلب انسانی تدریجی تربیت کے ذریعہ سے آہستہ آہستہ ان بجلیوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائے اور ان کو اپنی گرفت میں لے سکے۔''[۱۹]

مولانا اصلاحی نے اس بحث میں کئی اہم نکات اٹھائے ہیں، جن سے تورات اور دیگر اسفارِ انبیاء کا تعلق بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے عمومی اتفاق کے باوجود ہم یہ کہنے کی جسارت کریں گے کہ اگر تورات 'کامل حکمت' پر مشتمل نہیں تھی، تب بھی اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وہ یک بارگی نازل ہوئی۔ اگر وہ صرف الٰہی قانون پر مشتمل ہوتی تو بھی اس کا یک بارگی نزول حکمت خداوندی کے تقاضوں کے خلاف ہوتا۔ آخر صرف قانون کا دیا جانا ہی تو مقصود نہیں تھا، بلکہ اس پر عمل کرانا بھی مقصود تھا اور اس قانون کے ذریعے ہی فرد اور معاشرے کا تزکیہ مقصود تھا۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ پورا کا پورا قانونی ضابطہ ایک ہی موقع پر قوم کو دے دیا جاتا، بالخصوص جب مولانا اصلاحی یہ بھی قرار دیتے ہیں کہ اس قوم کی ذہنی استعداد پختہ نہیں تھی۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ تورات میں قانون کے علاوہ 'موعظت' بھی تھی، جو حکمت ہی کی ایک شاخ تھی

لیکن 'کامل حکمت' نہیں تھی۔ تورات میں توحید، آخرت اور رسالت کے علاوہ اخلاقیات کے متعلق تمام بنیادی مباحث بھی تھے۔ نیز اس میں پچھلی اقوام اور بالخصوص فرعون کے انجام سے حاصل ہونے والے دروس کے ذریعے 'تذکیر' کے پہلو بھی تھے۔ پھر تذکیر اور تزکیہ کا یہ مقصد اس صورت میں زیادہ بہتر طریقے سے حاصل ہوسکتا تھا کہ پورا قانون یک بارگی دے دیا جاتا، یا اس کے حصول کے لئے زیادہ بہتر طریقہ تدریجی نزول ہی کا تھا؟

مولانا امین احسن اصلاحی نے بعد میں خود اس قول سے رجوع کرلیا تھا اور بڑی شدت سے اس بات کے قائل ہوگئے تھے کہ تورات، بلکہ تمام کتبِ سابقہ، کا نزول تدریجی طور پر ہوا تھا۔ اس رائے کا اظہار انہوں نے سورۃ الفرقان کی تفسیر میں کیا ہے۔[۱۹] الف

قرآن سے تورات کے تدریجی نزول کے شواہد

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مختلف اوقات میں وحی کا نزول ہوتا رہا:

(۱) پہلی وحی:

اس وحی کا ذکر قرآن میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو طٰہٰ: ۹-۱۶، القصص: ۳۰، النمل: ۸-۹، النازعات: ۱۵-۱۹) ان مقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وحی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب رسالت پر فائز ہونے کی اطلاع دی گئی، آپ کو اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا علم دیا گیا، آخرت کا یقینی ہونا بتایا گیا اور آپ کو آپ کا مشن سمجھایا گیا کہ آپ نہ صرف فرعون اور اس کی قوم پر اللہ کی حجت تمام کریں گے، بلکہ بنی اسرائیل کی تربیت اور اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیں گے۔ پھر آپ کی دعا کے نتیجے میں آپ کو معجزات بھی دیے گئے اور آپ کی مدد کے لئے حضرت ہارون علیہ السلام بھی مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد دونوں کو وحی کی گئی۔ (القصص: ۳۵، طٰہٰ: ۴۲-۴۴)

(۲) بنی اسرائیل کی تربیت اور اصلاح کے لیے کی جانے والی وحی:

سورۂ ابراہیم میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۔(ابراہیم:۵)

اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو اور ان کو اللہ کے یادگار دن یاد دلاؤ۔ بے شک ان کے اندر ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

گویا جس طرح حضور ﷺ اہل عرب کو پچھلی اقوام کے انجام سے عبرت دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ کے ناقابل تبدیل قوانین کی وضاحت فرماتے تھے اور ان واقعات کے ذریعے مومنوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے، بعینہ یہی کام حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انجام دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جب ان کی قوم کے لوگوں نے ظلم وستم سے تنگ آ کر فریاد کی تو آپ نے انہیں قوموں کے عروج وزوال کے متعلق اللہ تعالیٰ کے قوانین کی طرف توجہ دلائی۔ (الاعراف:۱۲۸-۱۲۹) پھر آپ ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ فرعون کے خاندان کے ایک مومن نے بھرے دربار میں اپنی قوم کے سرداروں کو پچھلی اقوام کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا درس دیا۔ (المومنون: ۳۰-۳۳)

(۳) جادوگروں سے مقابلے کے وقت وحی:

جب جادوگروں نے اپنے کرتب دکھائے تو اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی۔ اس کا ذکر قرآن مجید نے مختلف مواقع پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ طٰہٰ میں ہے:

قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَى. وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَى ۔(طٰہٰ:۶۸۔۶۹)

ہم نے کہا ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے۔ اور تم اس کو جو تمہارے ہاتھ میں ہے زمین پر ڈال دو، یہ ان کے سارے سوانگ کو، جو انہوں نے رچایا ہے، نگل جائے گا۔ یہ جو انہوں نے دکھایا ہے یہ تو بس جادوگر کا کرتب ہے۔ اور جادوگر جہاں بھی جائے کامیاب نہیں ہوتا۔

(۴) بنی اسرائیل میں اجتماعی نظم پیدا کرنے کے لئے وحی:

سورۂ یونس میں ہے:

وَأَوْحَيْنَـآ إِلَـى مُوسَـى وَأَخِيْـهِ أَن تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتاً وَاجْعَلُواْ بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيْمُواْ الصَّلوٰةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس:۸۷)

اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں کچھ گھر ٹھہرالو، اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ، اور نماز کا اہتمام کرو، اور ایمان والوں کو خوش خبری دو۔

(۵) ہجرت کے لئے وحی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو با قاعدہ وحی کے ذریعے ہجرت کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ فرعون ان کا پیچھا کرے گا:

وَأَوْحَيْنَـا إِلَـى مُـوسَـى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْ إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ ۔(الشعرآء:۵۲)

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ ہمارے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ، بے شک تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

(۶) الواح پر لکھی گئی وحی:

کوہ طور پر آپ کو الواح دی گئیں، جن پر وحی لکھی ہوئی تھی۔ قرآن کریم میں ہے:

وَكَتَبْنَـا لَـهُ فِـيْ الأَلْـوَاحِ مِن كُلِّ شَـيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيْلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔

(الاعراف:۱۴۵)

اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وحی ان الواح پر اللہ تعالیٰ نے لکھی تھی یا، جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے لکھوائی گئی تھی۔ بائبل میں دونوں طرح کے بیانات ملتے ہیں۔ حدیث میں بھی خدا کے لکھنے کی تصریح ملتی ہے۔ ہم نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ خدا نے دو تختیوں پر لکھ کر احکام سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دیے، جن کی نقلیں انہوں نے خود دیگر تختیوں پر لکھ کر ہر قبیلے کو دے دیں۔

(۷) الواح دیے جانے کے ساتھ مزید وحی:

الواح دیے جانے کے موقع پر آپ کو مزید یہ وحی بھی کی گئی:

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ... الآية (الاعراف: ۱۴۵)

پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ اس کے بہتر طریقہ کو اپنائیں۔ میں تم کو عن قریب نافرمانوں کا ٹھکانہ دکھاؤں گا۔

(۸) وحی کے ذریعے ہی بنی اسرائیل پر بارہ سرداروں کا تقرر کیا گیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد کا وعدہ کیا گیا، جو چند شرائط کے ساتھ مشروط تھا۔ (المائدۃ:۱۲)

(۹) قتال کا حکم:

قرآن مجید اس بات کی بھی گواہی دیتا ہے کہ مصر سے ہجرت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر قتال کا حکم بھی نازل ہوا تھا۔ (المائدۃ: ۲۰۔۲۱) پھر جب بنی اسرائیل نے قتال سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی آئی کہ: ''یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام ٹھہری اور یہ زمین میں بھٹکتے پھریں گے''۔ (المائدۃ:۲۶)

(۱۰) خورد و نوش میں حلت و حرمت کا قانون:

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بعض طبی وجوہ کی بنا پر اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا، تاہم یہ شریعت ابراہیمی میں حرام نہیں تھا:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔ (آل عمران:۹۳)

کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں، مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام ٹھہرالی تھیں۔ کہہ دو کہ لاؤ تورات اور پڑھو اس کو، اگر تم سچے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تورات کے نزول سے پہلے بنی اسرائیل کے لئے وہ سبھی چیزیں حلال تھیں، جو شریعت ابراہیمی میں حلال تھیں اور جو سلیم انسانی فطرت کے مطابق کھانے کی چیزیں (الطعام) سمجھی جاتی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تورات میں یہ تصریح بھی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل پر جو مزید بعض چیزیں حرام کی گئیں وہ حضرت

ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے زمانے میں حرام نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہود کو چیلنج کیا گیا کہ اگر تم اس بات کو غلط سمجھتے ہو تو تورات لے آؤ اور اسے ثابت۔

بائبل کی کتابِ پیدائش میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کیے گئے بعض احکام بھی موجود ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کو دیے گئے۔ ان کو 'حضرت نوح علیہ السلام کا عہد نامہ' کہا جاتا ہے۔ یہود کے بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ 'غیر قوموں' کے لئے تورات کے تمام احکام پر عمل واجب نہیں، بلکہ ان کی نجات کا دارومدار حضرت نوح علیہ السلام کے عہد نامے پر عمل ہے۔[۲۰] اس عہد نامے میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

''سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے واسطے ہیں۔ میں نے ان سب کو نباتات کی طرح تمہیں دیا۔ مگر تم گوشت کو اس کے خون کے ساتھ مت کھانا۔ کیونکہ میں تمہارا خون ہر ایک جنگلی جانور سے اور ہر ایک آدمی کے ہاتھ سے طلب کروں گا۔ اس آدمی سے بھی، جو اپنے بھائی کو مار ڈالے میں، آدمی کی جان طلب کروں گا۔''[۲۱]

یہاں نباتات کی طرف اشارے اور جنگلی جانوروں کے ساتھ تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ 'کھانے کے واسطے' (الطعام) حلال جانوروں سے مراد مویشی (انعام) ہیں۔ قرآن مجید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شریعت ابراہیمی میں مویشیوں میں اصلاً چار ہی چیزیں حرام تھیں: مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا:

قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَماً مَّسْفُوحاً أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقاً أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔(الانعام:۱۴۵)

کہہ دو: میں تو اس وحی میں، جو مجھ پر آئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز، جس کو وہ کھائے، حرام نہیں پاتا، بہ جز اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون، یا سؤر کا گوشت، کہ ان میں ہر چیز ناپاک ہے، یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر جو مجبور ہو جائے، نہ چاہنے والا بنے اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی ابتدا میں یہی چار چیزیں حرام تھیں۔ بعد

میں ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر مزید کئی چیزیں حرام کردی گئیں :

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَإِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. وَلاَ تَقُولُواْ لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَـذَا حَلاَلٌ وَهَـذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُواْ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ لاَ يُفْلِحُونَ. مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. وَعَلَى الَّذِينَ هَادُواْ حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَـكِن كَانُواْ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۔(النحل: ۱۱۵۔۱۱۸)

اس نے تو تم پر بس مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو حرام ٹھہرایا ہے ۔ پس جو کوئی مجبور ہو جائے ، نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ، تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے ۔ اور اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھو ۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے ۔ ان کے لئے چند روزہ عیش اور پھر دردناک عذاب ہے ۔ اور جو یہودی ہوئے ان پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کیں جو ہم نے پہلے تم کو بتائیں ۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔

اس آخری آیت میں اشارہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۶ کی طرف نہیں ہے ، جیسا کہ الفاظ میں ظاہری مشابہت کی بنا پر عام طور پر مفسرین نے سمجھا ہے ،[۲۲] بلکہ دراصل یہ اشارہ سورۃ النحل ہی میں اس سے قبل آنے والی آیت ۱۱۵ کی طرف ہے ۔ گویا ان آیات میں یہ بات کہی گئی کہ یہود پر اصلاً یہی چار چیزیں حرام تھیں ، لیکن بعد میں ان کے اپنے ظلم کی وجہ سے ان پر مزید کئی چیزیں حرام کردی گئیں ۔ ان کی تفصیل سورۃ الانعام میں یوں دی گئی ہے :

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُواْ حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلاَّ مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۔ (الانعام:۱۴۶)

اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بہ جز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ ہو یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو ۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی ، اور ہم بالکل سچے ہیں ۔

اسفارِ خمسہ سے تورات کے تدریجی نزول کے شواہد

قرآن مجید کی ان تصریحات کے بعد جب ہم بائبل کا جائزہ لیتے ہیں تو اس سے بھی یہ حقیقت روز روزشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ تورات پوری کی پوری بہ یک وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں دی گئی تھی، بلکہ وقتاً فوقتاً حالات کی مناسبت سے ان پر وحی کا نزول ہوتا رہا۔ بائبل میں کئی مقامات پر وحی کے لکھے جانے کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ بھی کہ آخر عمر میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور پوری شریعت ان کے سامنے ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کردی۔ اس کی تفصیل کتابِ استثنا میں موجود ہے۔

اسفار خمسہ میں بلا مبالغہ سینکڑوں مقامات پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی ہونے کا ذکر ملتا ہے اور بعض مقامات پر یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ آپ کو خدا ہی کی جانب سے یہ حکم ملا تھا کہ آپ وحی کو محفوظ کرنے کے لئے لکھ دیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

''اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں۔''[۲۳]

''تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اس بات کی یادگاری کے لئے کتاب میں لکھ دے، اور یشوع کو سنادے کہ میں عمالیق کا نام ونشان دنیا سے بالکل مٹادوں گا۔''[۲۴]

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو یہ باتیں لکھ کیونکہ انہی باتوں کے مفہوم کے مطابق میں تجھ سے اور اسرائیل سے عہد باندھتا ہوں''۔[۲۵]

''اور موسیٰ نے اس شریعت کو لکھ کر اسے کاہنوں کے جو بنی لاوی اور خداوند کے عہد کے صندوق اٹھانے والے تھے اور اسرائیل کے سب بزرگوں کے سپرد کیا۔''[۲۶]

بائبل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے بنی اسرائیل سے جو ستّر (۷۰) افراد منتخب کیے تھے، وہ آپ کے فرائض کی تکمیل میں آپ کی مدد کرتے تھے، چنانچہ لکھنے کا کام بھی آپ انہی سے لیا کرتے تھے۔ بائبل کے اردو مترجمین نے کتاب گنتی کی اس عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ بنی اسرائیل کے بزرگوں میں سے ستّر مرد، جن کو تو جانتا ہے کہ قوم کے بزرگ اور ان کے سردار ہیں، میرے حضور جمع کر اور ان کو خیمۂ اجتماع کے پاس

لے آ، تا کہ وہ میرے ساتھ وہاں کھڑے ہوں اور میں اتر کر تیرے ساتھ وہاں باتیں کروں گا اور میں اس روح سے، جو مجھ میں ہے، کچھ لے کر ان میں ڈال دوں گا کہ وہ تیرے ساتھ قوم کا بوجھ اٹھائیں، تا کہ تو اسے اکیلا نہ اٹھائے۔'' ۲۷

اسی طرح کتاب استثناء کی ایک عبارت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

''سو میں نے تمہارے قبیلوں کے سرداروں کو، جو دانشور اور مشہور تھے، لے کر ان کو تم پر مقرر کیا۔'' ۲۸

تاہم محققین کے نزدیک ان دونوں عبارتوں کا ترجمہ ناقص ہے۔ اس سلسلے میں ممتاز مسیحی عالم جناب ایف ایس خیراللہ کی تحقیق ملاحظہ ہو:

''جس عبرانی لفظ شوطریم کا ترجمہ سردار کیا گیا ہے اس کے بنیادی معنیٰ ہیں لکھنے والے۔ (مقابلہ کیجیے عربی سطر بمعنی لکھنا)۔ سو یہ بزرگ نہ صرف مشہور تھے، بلکہ خواندہ بھی تھے...'' ۲۹

عربی بائبل میں شوطریم کا ترجمہ کتبة (لکھنے والے) کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''فقال الرب لموسی : اجمع لی سبعین رجلا من شیوخ اسرائیل الذی تعلم انهم شیوخ الشعب و کتبتهم۔'' ۳۰

رب نے موسیٰ سے کہا کہ میرے لئے بنی اسرائیل کے بزرگوں میں ستر ایسے آدمی جمع کر جن کے متعلق تو جانتا ہے کہ وہ قبیلے کے بزرگ اور لکھنے والے لوگ ہیں۔

''فاخذت رؤساء اسباطکم و هم رجال حکماء و ذوو خبرة ، فاقمتهم رؤساء علیکم رؤساء الف و مائة و خمسین و عشرة ، و کتبة علی اسباطکم۔'' ۳۱

پس میں نے تمہارے قبیلوں کے سرداروں کو چنا، اور وہ حکمت اور سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ تھے۔ سو میں نے انہیں تمہارے اوپر مقرر کیا کہ وہ تمہارے سردار ہوں ایک ہزار کے، ایک سو کے، پچاس کے اور دس کے، اور تا کہ تمہارے قبیلوں کے لکھنے والے ہوں۔

یوں مختلف اوقات میں نازل ہونے اور لکھی جانے والی وحی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخر عمر میں ایک نئی ترتیب کے ساتھ اور نئے انداز میں قلم بند کروایا اور تمام بنی اسرائیل کو جمع کر کے ان کے سامنے پیش کیا۔ اس نئے مرتب شدہ قانون کا بیش تر حصہ اب

کتابِ استثناء میں موجود ہے۔۳۲؎ اس از سرِ نو مرتب شدہ شریعت کو کتاب میں محفوظ کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام بنی اسرائیل کو خطاب کرتے وقت سنایا بھی اور پھر اسے عہد کے صندوق (Ark of the Covenant) میں رکھ کر بنی اسرائیل کے احبار اور علماء و فقہاء کو اس کا امین و محافظ اور نگران مقرر کر دیا۔ سِفر استثنا کا بیان ہے:

''اور موسیٰ نے اس شریعت کو لکھ کر اسے کاہنوں کے، جو بنی لاوی اور خداوند کے عہد کے صندوق اٹھانے والے تھے، اور اسرائیل کے سب بزرگوں کے سپرد کیا''۔۳۳؎

تورات کے لکھے جانے کا ذکر بائبل کے دیگر صحائف میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً کتابِ یشوع میں ہے:

''تب یشوع نے کوہ عیبال پر خداوند اسرائیل کے خدا کے لئے ایک مذبح بنایا، جیسا کہ خداوند کے بندہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا۔ اور جیسا کہ موسیٰ کی شریعت کی کتاب میں لکھا ہے۔''۳۴؎

یہودی اور عیسائی علماء بائبل کی ابتدائی پانچ کتابوں - پیدائش، خروج، احبار، گنتی اور استثناء- کو مجموعی طور پر تورات کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کتاب خروج سے شروع ہوتا ہے۔ آپ پر مختلف اوقات میں نازل ہونے والے احکام تین صحائف -خروج، احبار اور گنتی- میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان احکام میں سے بیش تر پانچویں کتاب -استثناء- میں ایک نئی ترتیب سے مل جاتے ہیں۔ بعض یہودی علماء کا خیال ہے کہ خروج، احبار اور گنتی کی کتابوں میں احکام تاریخی ترتیب سے جمع نہیں کیے گئے تھے، بلکہ مختلف روایات کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ بعد کے مرتبین نے انھیں تاریخی بیان میں اپنی سمجھ کے مطابق مناسب مقامات پر درج کر دیا۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ بعض احکام گنتی کی کتاب میں ہوں، لیکن وہ مصر سے ہجرت کے فوراً بعد دیے گئے ہوں۔ اگر اس موقف کو تسلیم کیا جائے تو بہت سی الجھنیں اور تعارضات رفع ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوہ سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو واقعات پیش آئے ان میں سے بیش تر کا ذکر کتاب خروج میں ہے۔ اسی کے ضمن میں یہ بھی مذکور ہے:

''اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں ... پھر اس نے عہد نامہ لیا اور لوگوں کو پڑھ

کر سنایا۔انہوں نے کہا کہ جو کچھ خداوند نے فرمایا ہے اس کو ہم سب کریں گے اور تابع رہیں گے۔''[۳۵]

یہاں یہ تفصیل مذکور نہیں ہے کہ یہ کون سے احکام تھے؟۔اکثر محققین کے نزدیک یہ احکام کتاب احبار کے ابواب ۲۵ اور ۲۶ میں مندرج ہیں۔اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ کتاب احبار باب ۲۵ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:''اور خداوند نے کوہ سینا پر موسیٰ سے کہا...'' اور باب ۲۶ کے اختتام پر یہ الفاظ ہیں:''یہ وہ شریعت اور احکام اور قوانین ہیں جو خداوند نے کوہ سینا پر اپنے اور بنی اسرائیل کے درمیان موسیٰ کی معرفت مقرر کیے''۔

Encyclopedia of Religions کے مقالہ نگار پہلی صدی عیسوی کے ایک یہودی عالم اشماعیل بن الیشع کا قول نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "No strict order as to 'earlier' and 'later' is observed in the Torah... which means that the chapters and verses of the Torah are not necessarily recorded in the order in which they were given or the order in which they happened. This interpretative principle and the identification of "book of the covenant" can be explained only if one assumes that the Torah was not given all at once. Indeed, the amora Yohanan bar Nappaha (fl. first half of the third century CE) transmits in the name of the tanna Bana'ah that "the Torah was given section by section"... Midrash tanhuma' tells that while the people of Israel were still enslaved in Egypt, "they possessed scrolls, in which they delighted from Sabbath to Sabbath, which said that the Holy One, blessed be He, would redeem them." [۳۶]

''تورات (اسفارِ خمسہ) میں 'پہلے' اور 'بعد' کی ترتیب کا کچھ خاص خیال نہیں رکھا گیا ہے... اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضروری نہیں ہے کہ تورات کے ابواب اور آیات اسی ترتیب میں ہوں جس ترتیب میں وہ دیے گئے، یا جس ترتیب سے وہ واقع ہوئے۔ یہ تفسیری اصول اور 'عہد کی کتاب' کی پہچان کی وضاحت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ فرض کیا جائے کہ تورات پوری کی پوری بہ یک وقت نہیں دی گئی۔ درحقیقت **اموره یوحنان بر نپها** (جو تیسری صدی عیسوی کے نصف اول میں گزرے ہیں) نے **تنّا بنعه** سے نقل کیا ہے کہ ''تورات ٹکڑوں ٹکڑوں میں دی گئی تھی''... **مدراش تنهمع** میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل مصر کی غلامی کے دور میں بھی ''اپنے پاس ایسے قرطاس رکھتے تھے جن میں وہ ہر سبت کے دن بشارتیں پڑھتے تھے، جن میں مذکور تھا کہ خدائے بزرگ و برتر انہیں نجات دلائے گا۔''

اس اقتباس سے کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ یہودی علماء اس بات کے قائل تھے کہ تورات کا نزول تدریجی طور پر ہوا اور یہ کہ ہجرت مصر سے قبل بھی تورات کا کچھ حصہ نازل ہوا تھا، دوسری یہ کہ مصر میں بنی اسرائیل ہر ہفتے اکٹھے ہوکر ان آیات کی تلاوت کرتے تھے۔ اور تیسری یہ کہ ان صحائف میں احکام کے ساتھ ساتھ واقعات جس ترتیب سے درج کیے گئے ہیں اس ترتیب کو بعینہٖ ماننا لازم نہیں ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، 'قرآن: انداز نزول کی حکمت'، ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ۲۱

۲۔ آلوسی، روح المعانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵ء، ج ۳، ص ۷۵۔

۳۔ ایضاً

۴۔ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور الافریقی، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ج ۱۱، ص ۶۵۶۔

۵۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۷، ص ۱۱۲

۶۔ قرآن: انداز نزول کی حکمت، ص ۲۱

۷۔ ایضاً ص ۳۴۔۳۵ ۸۔ کتاب استثنا: باب ۳۱

۹۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسیٰ، حدیث نمبر ۴۷۹۳

۱۰۔ کتاب خروج: باب ۲۴، آیات ۳۔۴؛ باب ۳۲، آیات ۱۵۔۱۶

۱۱۔ قرآن: انداز نزول کی حکمت، ص ۲۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۵ ۱۳۔ کتاب حزقیال: باب ۱، آیت ۱۔۲

۱۴۔ ایضاً: باب ۲۴، آیت ۱ ۱۵۔ کتاب حجی: باب ۲، آیت ۱

۱۶۔ ایضاً، آیت ۱۰ ۱۷۔ ایضاً، آیت ۲۰

۱۸۔ امین احسن اصلاحی، مبادیٔ تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۹۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔۱۱۹

۱۹/الف اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم کا مقالہ بہ عنوان 'نزول و تدوین تورات: مسلمان اہل علم کی آراء کا تنقیدی جائزہ' (منتظر طبع)

۲۰۔ ملاحظہ کیجئے یہودی ربی مائیکل ویشوگروڈ (Michael Wyschogrod) کا مقالہ زیر عنوان Islam and Christianity in the Perspective of Judaism (اسلام اور مسیحیت، یہودیت کے تناظر میں)۔

Al-Faruqi, Isma'il Raji, Trialogue of the Abrahamic Faiths, Virginia: International Institute of Islamic Thought, 1991, pp 13-18

۲۱۔ کتاب پیدائش: باب ۹، آیات ۳۔۵

۲۲۔ مفسرین کرام نے بالعموم سورہ النحل کی آیت ۱۱۸ کے اشارہ کو سورۂ انعام کی آیت ۱۴۶ کی طرف سمجھا ہے۔ (ملاحظہ کیجیے ابن الجوزی، زاد المسیر، ج ۴، ص ۳۸۳، قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج ۱۰، ص ۱۹۷، بیضاوی، تفسیر البیضاوی، ج ۳، ص ۲۲۴، آلوسی، روح المعانی، ج ۱۴، ص ۲۵۷) امام طبری نے اس قول کو عکرمہ اور قتادہ سے نقل کیا ہے (جامع البیان، ج ۱۴، ص ۱۲۷)۔ اردو مفسرین میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (تفہیم القرآن،

۵۲۲/۲، طبع لاہور، ۱۹۷۴ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی (بیان القرآن، ۱/۵۸۷، طبع ملتان، ۱۴۲۷ھ) کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ رائے پیش کی ہے کہ سورۂ النحل کی آیت ۱۱۸ کا اشارہ اس سے اوپر کی آیت ۱۱۵ ہی کی طرف ہے (تدبر قرآن، ۴/۴۶۰)

۲۳ کتاب خروج: باب ۲۴، آیت ۴ ۲۴ ایضاً: باب ۱۷، آیت ۱۴

۲۵ ایضاً: باب ۳۴، آیت ۲۷ ۲۶ کتاب استثناء: باب ۳۱، آیت ۹

۲۷ کتاب گنتی: باب ۱۱، آیات ۱۶-۱۷ ۲۸ کتاب استثناء: باب ۱، آیت ۱۵

۲۹ قاموس الکتاب، مسیحی اشاعت خانہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۲۵

۳۰ **الکتاب المقدس، بیروت، ۱۹۸۹ء، سفر العدد، اصحاح ۱۱، آیة ۱۶**

۳۱ **سفر تثنیة الاشتراع، اصحاح ۱، آیة ۱۵**

۳۲ اسفار خمسہ میں سِفر استثناء اپنے اسلوب، ذخیرۂ الفاظ اور مضامین کے لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ بعض یہودی علما نے اسے **مشنه توراة** یعنی 'دہرائی گئی تورات' کہا ہے۔ اس کا انگریزی نام Deuteronomy دراصل یونانی لفظ Deuteronomion سے ماخوذ ہے۔ تیسری صدی قبل از مسیح میں بائبل کا یونانی زبان میں ترجمہ (مشہور ہفتادی ترجمہ Septuagent) کیا گیا تو مترجمین نے یہ فرض کیا کہ اس صحیفے میں ان احکام کی تکرار ہوئی ہے جو پہلے چار اسفار میں مندرج ہیں، اس لئے انہوں نے اسے یہ نام دیا۔ عربی میں اسے **تثنیة الاشتراع** کہتے ہیں۔ رومن کیتھولک اردو ترجمے میں اسے 'تثنیۂ شرع'، جب کہ پروٹسٹنٹ ترجمے میں اسے استثناء کہا گیا ہے۔

۳۳ کتاب استثنا: باب ۳۱، آیت ۹-۱۳

۳۴ کتاب یشوع: باب ۸، آیات ۳۰-۳۱

۳۵ کتاب خروج: باب ۲۴، آیت ۴، ۷-۸

۳۶ Encyclopedia of Religions, vol. 14, p 557, New York, 1987

☆☆☆

بیسویں صدی میں
عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقا

——————— ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

بیسویں صدی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس صدی میں دیگر علوم وفنون کی طرح خودنوشت نگاری کے فن نے بھی غیر معمولی ترقی کی اور یہ ترقی ہمہ جہت رہی۔ اگر ہم اس ارتقاء کے اسباب وعوامل کا جائزہ لیں تو اس کی جڑیں بے حد گہری نظر آئیں گی۔ ان میں سے بعض کا تعلق ماضی کی مرحلہ وار تبدیلیوں اور انقلاب سے ہوگا تو بعض بالکل نئے اور جدید تقاضوں کی پیداوار ہوں گے۔

بلاشبہ عربی ادب میں بعض مثبت تبدیلیاں انیسویں صدی کے آغاز ہی سے آنی شروع ہوگئی تھیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ بعد میں یہی تبدیلیاں عربی ادب کے مکمل عروج کا سبب بن گئیں۔ دور حاضر میں علوم وفنون کے ارتقاء، سائنس اور ٹکنالوجی کی مقبولیت سے انسان کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان سے اس کی شخصیت کے بعض خفیہ پہلو ابھر کر سامنے آئے۔ فطرت اور انسان کو سمجھنے کی کوشش بہت پہلے سے ہوتی رہی ہے۔ اس بارے میں انسانی نقطہ ہائے نظر مختلف اور بعض اوقات متغایر رہے ہیں۔ اسی نوعیت کی ایک کوشش ڈارون کی کتاب 'أصل الأنواع' ہے۔ اس میں پیش کردہ نظریۂ ارتقاء کا عصر جدید میں انسان کی تفہیم میں بڑا نمایاں رول رہا ہے۔[1] اس کے بعد اس پر مزید بحث ومباحثہ ہوا اور باقاعدہ ایک علم 'علم الإنسان' (Anthropology) کے نام سے وجود میں آیا۔ ان کوششوں سے موجودہ انسان کو اپنی حقیقت معلوم کرنے اور اپنا مزاج اور طبیعت سمجھنے میں مدد ملی۔ پھر عصر حاضر کے ایک اور مفکر فرائڈ نے علوم انسانی میں علم نفسیات کی اہمیت کو اجاگر کر کے

نئی نسل کو نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کا خوگر بنایا۔ اس نفسیاتی تجزیہ کے لیے انسان کے اپنے بیانات سے زیادہ اور کوئی چیز مفید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس سے خودنوشت نگاری کو بے حد اہمیت حاصل ہوگئی۔[۲]

عربی زبان میں خودنوشت نگاری کے ارتقاء کے لیے مذکورہ علوم کے علاوہ بعض دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں۔ خود جزیرہ عرب کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر ایک ہلکی نظر ڈالنے سے بعض دوسرے مؤثر اسباب کی طرف رہنمائی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں پوری دنیا کو جو مسائل درپیش تھے ان میں مختلف قوموں اور ممالک کے بقاو وجود کا مسئلہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جنگ عظیم اول اور دوم کی تباہ کاریوں سے انسان اپنے مستقبل کے بارے میں سخت اندیشوں سے دوچار تھا۔ عالم اسلام اور خاص طور سے عالم عرب میں معقول اسباب کی بنیاد پر یہ اندیشے اور خدشات کچھ زیادہ ہی محسوس کیے جارہے تھے۔ ان کی وجہ سے لازماً قومی وجود اور شخصی وجود کے اثبات اور تحفظ کی طرف توجہات زیادہ مرکوز ہوئیں۔ پھر عالم عرب کی سیاسی اور سماجی صورت حال کا ایک عجیب وغریب پہلو اور بھی تھا۔ وہاں جن علاقوں پر اپنوں کی حکومت تھی وہ بھی عدل ومساوات کے سلسلے میں مخلص نہیں تھے۔ سماج کو مختلف حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، جس کی وجہ سے قومی ذرائع و وسائل سے انتفاع کے فطری حق سے بہت سے لوگ محروم کردیے گئے تھے۔ جب مختلف اسباب کے باعث ان لوگوں کو کچھ آگے بڑھنے کا موقع ملا تو انھیں قوم کے بااثر لوگوں سے سخت کبیدگی اور نفرت ہوگئی اور اپنی حالت زار پر افسوس اور ندامت ہوئی۔ داخل کی اس خلجانی کیفیت نے انھیں کچھ کہنے اور لکھنے پر مجبور کردیا۔[۳]

مذکورہ بالا اسباب کی وجہ سے بیسویں صدی عیسوی کے عرب علماء نے اپنی ذات اور شخصیت کا گہرائی سے جائزہ لیا اور اسے دنیا کے سامنے ایک ادب کی زبان اور اسلوب میں پیش کیا۔ چنانچہ اس صدی کے اوائل ہی میں اظہار ذات کی بہت سی شکلیں معروف و متداول ہوگئیں، جن سے عربی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوئے اور اس کی شناخت ممکن ہوسکی۔ اس کام میں متوسط طبقے کے ادباء نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ ان لوگوں کی کوششوں سے لوگوں کے اندر حریت، استقلال، دستور اور جمہوری نظام کے مفاہیم واضح ہوئے اور ان کے حصول

کے لیے منظّم جدوجہد کا آغاز ہوا۔اس مقصد کے لیے مصری ادباء نے ایک ایسا ادب پیش کیا جو قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کے عین مطابق تھا اور جس میں کسی کی نقالی یا تقلید نہیں کی گئی تھی۔

جدید عرب خودنوشت نگاروں نے اپنے ذاتی اور انفرادی احساس کے تحت جو کچھ لکھا اس میں لوگوں کے جذبات کی بھرپور عکاسی تھی۔انھوں نے عربی ادب، مغربی ادب اور جدید افکار ونظریات سے مدد لی۔ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بحیثیت مجموعی اپنے مؤلفین کے فکری، روحانی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات سے متعلق حقائق سامنے لاتی ہیں۔بلاشبہ ان مؤلفین کا اپنے زمانے کی تبدیلیوں میں بڑا نمایاں رول رہا ہے۔ان مؤلفین نے اپنی ذات سے متعلق تحریروں کو جدید مفہوم اور اسلوب سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ان کے سامنے مغربی زبانوں کی خودنوشت سوانح عمریاں بطور نمونہ موجود تھیں۔انھوں نے اپنے فن میں کبھی کبھی اس قدر جدت اور ندرت پیدا کی کہ یہ مغرب کے خودنوشت قلم کاروں سے بھی آگے بڑھ گئے۔[۴]

جدید عربی ادب کی بعض خودنوشت سوانح عمریوں میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قدیم عربی خودنوشتوں میں موجود نہیں تھیں، مثلاً اپنے ماحول اور گرد و پیش سے لاتعلقی کا اظہار، قدیم موروثی افکار کے خلاف اظہار بغاوت، اپنے بعض جرائم کا صریحاً اعلان وغیرہ۔[۵] اسی طرح دور جدید میں خودنوشت سوانح سے مشابہ بعض دوسری اقسام کی تألیف و تدوین کا رواج پہلے کے بالمقابل زیادہ ہوگیا ہے۔یہ سوانح مذکّرات، اعترافات اور اسی طرح کے دوسرے ناموں سے موسوم ہوئیں۔پھر جدید دور میں افسانوی طرز پر خودنوشت سوانح عمری لکھنے کا فن بھی بہت آگے بڑھ گیا ہے۔قدیم عربی ادب میں بھی اس طرز تالیف کا وجود ملتا ہے، لیکن جدید دور میں اس کی مقبولیت اور رواج میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔اسی طرح خطوط اور مراسلات کی شکل میں اپنے جذبات کی ادائی کے لیے باضابطہ کتابیں تالیف کی گئیں۔توفیق الحکیم کی 'زہرۃ العمر' احمد امین کی 'إلی ولدی' اور محمد حسین کی 'ولدی' وغیرہ اسی قبیل کی تصنیفات ہیں۔

یوں تو ہر ادبی عمل کی ایک انفرادی اور امتیازی حیثیت ہوتی ہے، اس لیے اسے کسی دوسرے ادبی عمل کے ساتھ شامل کرنا مناسب نہیں ہوتا۔لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت

ہے کہ بعض ادبی اعمال میں اس قدر مطابقت ہوتی ہے کہ انھیں کسی تقسیم کے وقت ایک ساتھ رکھنے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ ہمارے پاس موجود خودنوشت سوانح عمریوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم اغراض و مقاصد کی روشنی میں ان خودنوشت سوانح عمریوں کی تقسیم کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کے مؤلفین کی دلچسپیاں باہم دگر مختلف ہونے کے باوجود بعض امور میں کبھی کبھی یکسانیت رکھتی ہیں۔ پھر خودنوشت کی مختلف بنیادی شرائط کی تکمیل میں بھی ان میں بعض کی بعض سے مطابقت ہوتی ہے اور بعض سے مغایرت۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ہر خودنوشت کا ایک محرک ہوتا ہے اور یہی محرک خودنوشت کے مضمون کا تعین کرتا اور اس کی غرض و غایت کو واضح کرتا ہے۔ اس طرح ہم جدید عربی خودنوشت سوانح عمریوں کو ان کے اغراض و مقاصد، طریقہ کار اور محرکات کی روشنی میں درج ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- فکری خودنوشت سوانح عمریاں

جدید عربی خودنوشت سوانح عمریاں اپنے مؤلفین کے افکار و خیالات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ ان سے ان مفکرین کی فکری خوبیاں اور امتیازی اوصاف ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی تربیت میں کون سے عوامل اور محرکات کارفرما رہے ہیں۔ اور اس راہ میں انھیں کس طرح کی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر سے تعارف کے بعد عرب مفکرین اور ادباء کی ایک قابل ذکر تعداد ان موروثی رسوم و رواج کے خلاف آواز اٹھانے لگی جو ایک زمانے سے ان کے معاشرے میں معروف و مشہور تھیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد چونکہ انگریزوں نے عربوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں کی تکمیل نہیں کی اور پورا عالم اسلام خاص طور سے عالم عرب اس جنگ کا خصوصی نشانہ بنا، اس لیے عربوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا۔ اور اس کے نتیجے میں غور و فکر کی مختلف راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ اپنے تشخص اور انفرادیت سے متعلق جب سرگرم تلاش و جستجو ہوئی تو کچھ ادباء و مفکرین نے اپنے ورثہ سے مایوس ہوکر پوری تہذیب و تمدن کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور کچھ دوسرے

اپنے ماضی ہی سے امیدیں وابستہ کیے رہے۔ پھران میں ایک تیسرا گروپ بھی تھا جو دونوں کے درمیان مطابقت اوراعتدال پیدا کرنے کے لیے سرگرم عمل تھا۔ ۶ ان تمام فکری رجحانات و میلانات سے عربوں کے سامنے مختلف نوعیت کے مسائل پیدا ہوگئے۔ مذکورہ فکری میلانات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور متغایر تھے کہ ان کی ابتدا ہی سے ایک الگ پہچان اور شناخت بن گئی۔ جدید عربی خودنوشت سوانح عمریاں ان تمام رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں اوران میں اختلافات کے باعث یہ سوانح بھی مختلف حیثیات کی مالک ہیں۔اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبدالرحمٰن شکری، عقاد، مازنی اوراحمدامین نے جو کچھ لکھا وہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔

فکری اعتبار سے جدید عربی خودنوشت سوانح کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان لکھنے والے زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ تھے۔ جب ان لوگوں کو یورپی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے واقفیت ہوتی تو انھیں اپنے معاشرے اوراس کی رسوم وروایات سے نفرت ہونے لگی، چنانچہ ان لوگوں نے یورپ سے اخذکردہ جدید مفاہیم کی روشنی میں ادب وثقافت کے قدیم مفاہیم کے گردشکوک وشبہات کا اظہار کیااوراپنی بات کو مستحکم کرنے کے لیے مغربی ادب وثقافت کے بہت سے حصوں کا ترجمہ بھی کیا۔ جدید خودنوشت نگاروں میں جوادباء خاص طور سے مغرب سے متاثر نظر آتے ہیں ان میں طٰہٰ حسین، سلام موسیٰ اورتوفیق الحکیم قابل ذکر ہیں۔ان میں بعض ادباء ایسے بھی ہیں جنھوں نے مغرب ومشرق کے درمیان تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی، اس سلسلے میں احمدامین اور عباس محمود العقاد کی کوششیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ البتہ ان ادیبوں میں میخائیل کی شخصیت وہ واحد شخصیت ہے جومغرب سے بے حد قریب ہونے کے باوجود اپنی فکری دنیا کی ایک علیٰحدہ تشکیل وتعمیر میں کامیاب ہوگئی۔ انھوں نے مشرق ومغرب سے بلند ہوکر لوگوں کے سامنے ایک آفاقی نظریہ پیش کیا جس کی بنیادیں دونوں تہذیبوں سے مستعار تھیں۔ ۷ عباس محمود العقاد اپنی خودنوشت میں دیگر تالیفات کی طرح بیش تر سیاسی ومعاشرتی مسائل میں منفرد نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات پر بے حد اعتماد ہے۔ وہ اپنے افکار کو پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں،ان کی تحریروں میں ان کی انا اورانفرادیت سب سے نمایاں ہے۔

جدید عرب ادباء مغرب سے مستعار اپنے افکار اور اپنے معاشرے کے درمیان ایک خلا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس خلا سے پریشان ہوکر وہ جھنجھلاہٹ اور اضطراب کا شکار ہوجاتے ہیں۔ طہٰ حسین کی 'مستقبل الثقافۃ' اور 'فی الشعر الجاہلی' اس کی بین مثال ہے۔ اپنی کتاب 'الایام' میں بھی انھوں نے معاشرے کی تنگ دامنی پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے اور لوگوں کو قدیم مفروضوں سے نکلنے کی دعوت دی ہے۔[۸] الغرض جدید عربی سوانح میں عصر حاضر کی ضروریات اور افکار و مسائل بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیے گئے ہیں۔ معاشرے کی فکری اور نفسیاتی مشکلات کے علاوہ ان میں ادبی و فکری مسائل کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید عربی شخصیت کے خدوخال اب بڑی حد تک نمایاں ہوگئے ہیں۔ یہ قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک امتیازی شان کی مالک بن چکی ہے اور اب یہ اس قابل ہے کہ مقامی اثرات سے بالاتر ہوکر پورے عالم میں اپنے انمٹ نقوش ثبت کر سکے۔

۲- سیاسی خودنوشت سوانح عمریاں

سیاسی قسم کی خودنوشت سوانح عمریوں میں انشا پرداز کے سیاسی میدان کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ان سے سیاسی دنیا میں اس کے کردار اور نمایاں کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس نوعیت کی خودنوشت سوانح عمریاں زیادہ تر دفاع کے مقصد سے لکھی گئی ہیں، کیونکہ ان کے مؤلفین کا سیاست کے بارے میں مخصوص نقطۂ نظر اور موقف رہا ہے، جس پر مختلف حلقوں سے انھیں تنقید و تعریض کا نشانہ بھی بننا پڑا، اس لیے اپنے افکار و خیالات اور اصول و ضوابط کی وضاحت ان کے لیے لازم تھی۔

جدید عربی ادب میں احمد شفیق کی کتاب 'مذکراتی فی نصف قرن'[۹] اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں اپنے بعض شخصی احوال کے ساتھ ۱۸۷۳ء سے ۱۹۲۳ء تک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ یہ کتاب مصر کی جدید تاریخ کا ایک بہترین ماخذ ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب میں خدیو توفیق کی حمایت اور عرابی پاشا کی مخالفت کے اسباب تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اپنے مؤلف کے ایک خاص موقف کی

وضاحت اور دفاع کا کام انجام دیتی ہے۔

فی الواقع انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مصر کے اندر جو سیاسی اور اصلاحی تحریکیں برپا ہوئی تھیں ان کی وجہ سے سیاسی یادداشتیں جمع کرنے کی روایت کافی مقبول ہوئی۔ ان تحریکوں کے قائدین نے خاص طور سے مختلف مسائل کے بارے میں اپنا مخصوص نقطۂ نظر واضح کیا۔ خود احمد عرابی پاشا نے 'کشف السقار من سرالأسرار' کے نام سے اپنے مذکرات قلم بند کیے۔ اسی طرز پر ان کے رفیق محمود فہمی نے اپنے ذاتی تاثرات قلم بند کیے۔ اس میں انقلاب کے دوران میں پیش آنے والے واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اسی طرح عبداللہ ندیم نے بھی انقلاب کے بارے میں اپنی یادداشتیں قلم بند کر کے احمد عرابی کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ یہ یادداشتیں بعض دوسرے خطوط اور مقالات کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں 'عبداللہ الندیم و مذکرات الشخصیۃ' کے نام سے شائع ہوئیں۔

احمد لطفی السید کی 'قصتہ حیاتی'، عبدالعزیز فہمی کی 'ہذہ حیاتی' اور محمد حسین ہیکل کی 'مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ' اسی طرز کی خودنوشت سوانح حیات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مصر اور عرب کی سیاست میں بڑا اہم رول رہا ہے۔ سیاست اور فکر کے تعلق سے ان کے کچھ مخصوص نظریات تھے۔ ان میں سے بعض عوام کی عام سوچ سے ہم آہنگ نہیں تھے، اس لیے انھیں عوام کے مختلف اور متضاد ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے موقف کی باضابطہ وضاحت کے لیے ان میں سے ہر ایک نے اپنی خودنوشت لکھی اور اس میں سیاست، معاشرت اور فکری اصلاح کے تعلق سے اپنی سعی و کوشش اور جدوجہد کا دفاع کیا۔

مذکورہ بالا شخصیات میں سے لطفی السید کی خدمات اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ انھوں نے اپنی فکر و فلسفہ کی ترویج و اشاعت اور اس کے مطابق قوم کی اصلاح و تربیت کے لیے بے حد سنجیدہ اور مفید لائحہ عمل وضع کیا۔ اخبار الجریدہ کا اجرا، الحزب الوطنی کا قیام اور سرگرم شرکت، المصر للمصریین کا نعرہ اور فلسفہ ارسطو کی نمائندہ کتابوں کا ترجمہ، یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سیاست اور معاشرت سے قوم کو واقف کرانے کے لیے وہ یونانی فلسفہ کو خاصی اہمیت دیتے تھے۔ دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ اور منتقلی کا کام انجام دینا لطفی السید کا طرۂ

امتیاز ہے۔ان سے پہلے اس کام کی طرح فتحی زغلول نے ڈالی تھی۔انھوں نے سیاست اور معاشرت سے متعلق جدید مغربی مفکرین کی بعض شہرہ آفاق تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کیا۔اس سے لوگوں کے اندر حریت اور استقلال کا معنی اور مفہوم اور اس کے اصول و مبادی کا علم پیدا ہوا اور وہ دنیاوی ترقی کے لیے علمی تیاریوں کی ضرورت سے واقف ہوئے۔[۱۰]

محمد کرد علی، عبدالرحمٰن رافعی، محمد فرید اور ملک عبداللہ کے مذکرات کا شمار بھی سیاسی نوعیت کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ان میں سے اول الذکر دو کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔کرد علی نے اپنے مذکرات میں ان الزامات کا دفاع کیا ہے جو جنگ عظیم اول کے دوران عثمانی حکم رانوں سے دوستی کے سبب ان پر لگائے جاتے تھے۔اسی طرح ان پر شام میں فرانسیسیوں کے غلبہ کے دوران ان کی مدد کرنے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔[۱۱] عبدالرحمٰن رافعی نے اپنے مذکرات میں سیاسی اور قومی نظریات کے علاوہ اپنے زمانے کی تاریخ کا ریکارڈ بھی محفوظ کر دیا ہے۔اس میں انھوں نے 'الحزب الوطنی' اور اس کے زعماء محمد فرید اور مصطفیٰ کامل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔کتاب میں ان کی زندگی کے ابتدائی مراحل زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں۔اہم تاریخی واقعات کی تاریخیں بھی مذکور ہیں۔اس لیے تاریخ کے تعلق سے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ یہ کتاب ان کی پیدائش ۱۸۸۹ء سے لے کر تاریخ اشاعت ۱۹۵۱ء تک کے حالات کو محیط ہے۔[۱۲]

۳- افسانوی خودنوشت سوانح عمریاں

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں جو سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی نظریات مصر اور بیرون مصر فروغ پا رہے تھے، عرب مفکرین اور ادباء نے جس طرح انھیں اپنی دوسری تحریروں میں برتنے اور پیش کرنے کی کوشش کی اسی طرح انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں بھی ان کو جگہ دی۔ان ناولوں اور افسانوں میں یوں تو فرضی کردار پیش کیے جاتے ہیں اور ان کے پردے میں مؤلفین اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہیں، لیکن بعض ناول اور افسانے ایسے ہیں جن پر ایک معمولی سی نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے کردار فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں

اور یہ کہ ان کا مصنف خود ان کا ایک بڑا ہیرو ہے۔ ایسے لوگ گویا اپنی ذات کی تعبیر اور اپنی بات کی تشریح کے لیے براہ راست ذرائع اختیار کرنے کے بجائے بالواسطہ طور طریقے سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی اظہار ذات کی ایک قسم ہوئی اور جدید دور میں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اس طرز کی خودنوشت سوانح عمریوں میں، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، اپنے زمانے کے تمام ادبی، فکری اور سیاسی رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ بس اسلوب اور طریقۂ کار کا فرق ہو جاتا ہے۔[۱۳] چنانچہ جس طرح انیسویں صدی عیسوی میں رفاعہ طہطاوی، علی مبارک اور شدیاق نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں تعلیم کی ضرورت اور نئی تہذیب کو اسے اختیار کرنے کی دعوت دی اسی طرح مویلحی نے اپنے ناول 'حدیث علی بن ہشام' اور ابراہیم نے 'لیالی سطیح' میں اس کی ضرورت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ محمد حسین ہیکل کی کتاب 'زینب' میں اصلاح و تنقید کا یہ رنگ مزید گہرا ہوا۔ اس میں قاسم امین کی تحریک آزادی نسواں سے متاثر ہو کر معاشرتی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔[۱۴] پھر توفیق الحکیم نے اپنی کتاب 'عودۃ الروح' پیش کر کے اس فکری اضطراب اور بے چینی کی بھرپور عکاسی کر دی جس سے اس زمانے کے مفکرین دوچار تھے۔ نوبت بہ ایں جاں رسید کہ اس کتاب میں انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو فراعین مصر اور فرعونیت کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔[۱۵] اس کے بعد مازنی کے افسانوں اور ناولوں میں اس فکری اضطراب کی مزید تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں روشن خیالی، مغربیت زدگی اور فکری دیوالیہ پن کا مزید سامان ملتا ہے۔ ان تحریروں میں عورت کا رول کچھ زیادہ ہی ابھرا ہوا ہے۔ ہیکل کے ناول میں عورت محبت کے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی تھی، لیکن یہاں وہ اظہار سے آگے بڑھ کر بقدر ضرورت لطف اندوز ہوتی ہے۔ عقاد کے ناول 'سارۃ' میں جدید عورت کا کردار اور زیادہ نمایاں ہوا ہے اب وہ صرف محبت ہی نہیں کرتی ہے، بلکہ اپنے پسندیدہ محبوب کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر لیتی ہے اور جب چاہتی ہے اسے اپنے دربار سے ٹھکرا دیتی ہے۔ گویا عقاد اپنے تجربات کی رو سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے زمانے کی عورت آزادی کے متوقع حدود سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔

جدید افسانوی خودنوشتوں میں ایک ہی کردار کی جو مختلف شکلیں نظر آتی ہیں اور مختلف امور و مسائل کے بارے میں متعدد فکری رخ نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں عرب اپنی شخصیت کی تلاش میں مختلف وادیوں میں بھٹکتے رہے اور کسی ایک بات پر ان کا اتفاق نہیں ہو پایا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک فکری اضطراب سے دوچار تھے اور ان کی تحریروں میں اس اضطراب کی عکاسی ہو رہی تھی، خاص طور سے ان تحریروں میں جو دلی کیفیات اور اندرونی جذبات کی آئینہ دار ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کا فکری انتشار آج بھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب وہ کسی حد تک اپنی شخصیت اور حقیقت کی تلاش میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

۴- کسی مخصوص گوشۂ حیات سے متعلق خودنوشت سوانح عمریاں

اس صنف خودنوشت میں انشا پرداز اپنے کسی مخصوص گوشۂ حیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ گوشۂ ادب، فن، سائنس یا اس کے علاوہ کوئی اور ہوسکتا ہے۔ جدید عربی ادب میں بہت سے لوگوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنی پوری زندگی کو موضوع بنایا ہے، لیکن بعض نے اپنی زندگی کے کسی نمایاں پہلو کو۔ اس کی ایک مثال جرجی زیدان کی 'مذکرات' ہے، جس میں انھوں نے اپنے خاندان کے فقر و فاقہ، جہالت اور لاعلمی کا بڑی جرأت اور صاف گوئی سے تذکرہ کیا ہے۔[۱۶] یوسف وہبی کی مذکرات کا شمار بھی اسی قسم میں ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے ڈرامہ کے فن سے اپنی دلچسپی کے اسباب اور اس کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ فن ڈرامہ ہی سے متعلق فاطمہ رشدی کی مذکرات بھی ہے۔

اس قسم میں وہ یادداشتیں بھی شامل کی جائیں گی جنھیں عرب ادیبوں نے اپنے بیرونی اسفار کے دوران تحریری شکل دی۔ اس میں انھوں نے اپنے مشاہدات اور ملاحظات قلم بند کیے ہیں۔ اس میں ان کی ذاتی زندگی کے کچھ احوال بھی آ گئے ہیں۔ اس طرح کے ادباء میں امین ریحانی، مازنی اور طٰہٰ حسین کے نام بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حسین فوزی کی 'سندباد فی رحلۃ الحیاۃ'[۱۷] بھی اس نوعیت کی تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے ان حالات کی تصویر کھینچی

ہے جن سے گزر کر وہ زندگی کے اس مرحلے تک پہنچ چکے تھے۔

ان کے علاوہ شابی کی 'مذکرات'[۱۸] یحییٰ حقی کی 'خلیہا علی اللہ'[۱۹] اور توفیق الحکیم کی 'یومیات نائب فی الأریاف'[۲۰] بھی اسی قسم میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان تینوں ادباء نے حکومت کی تفویض کردہ ذمہ داریوں کے تحت مختلف دیہاتوں میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ بسر کیا۔ ان کی مذکورہ کتابوں میں یہی حصہ زیادہ غالب ہے۔ بقیہ زندگی کے دوسرے حصے برائے نام ہیں۔ ان سب نے دیہاتی زندگی کو مزید بہتر بنانے اور کسانوں کے حقوق و واجبات کا تحفظ کرنے کی پرزور وکالت کی ہے۔

مذکورہ بالا تصنیفات کے علاوہ بھی عربی زبان میں بہت سی دوسری تصنیفات ہیں جو اپنے لکھنے والوں کی ایک مخصوص تصویر پیش کرتی ہیں۔ دور حاضر میں تحریک الاخوان المسلمون کے متعلقین میں سے بعض نے راہ حق میں ابتلاء و آزمائش کی روداد یں قلم بند کی ہیں۔ یہ اگرچہ ان کی زندگی کے ایک مخصوص گوشہ (یعنی تحریک اور دعوتی جدوجہد) کو پیش کرتی ہیں، لیکن چونکہ یہ تحریریں خلوصِ قلب اور دل کی یکسوئی کے ساتھ لکھی گئی ہیں اس لیے اثر انگیزی اور سحر بیانی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں زینب الغزالی کی 'ایام من حیاتی' احمد رائف کی 'البوابۃ السوداء' اور عمر تلمسانی کی 'من سجل ذکریاتی' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس پوری بحث میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جدید عربی ادب میں خودنوشت نگاری کی تقریباً تمام اقسام پائی جاتی ہیں۔ قدیم عربی سرمایے میں بعض اقسام کی طرف غفلت برتی گئی تھی یا ان پر توجہ دی گئی لیکن ان کا حق ادا نہیں ہوسکا تھا۔ اس کی تلافی جدید عربی ادب سے کسی حد تک ہوجاتی ہے۔ اب یہ ادب اس قدر مالا مال ہو چکا ہے کہ بجا طور پر عالمی ادب کی صف میں کھڑا ہونے اور ان کی ہم سری کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ علی ادہم، علی ہامش الادب والنقد، دار الفکر العربی، قاہرہ، ص ۳۲

۲۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ڈارون اور فرائڈ کے نظریات کو ایک حقیقت کے طور پر

دیکھا جارہا تھا۔ بعد میں ان کی یہ حیثیت باقی نہیں رہی۔ ان کی تائید وتردید میں تفصیل سے بحثیں ہوچکی ہیں۔ ان کے سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر بھی سامنے آچکا ہے۔

۳۔ Modern Arabic Literature, J.A Haywood, Landon, pp.163-166

۴۔ علی ہامش الادب والنقد ،ص۲۸-۲۹

۵۔ جرونیام، حضارۃ الإسلام، مکتبۃ مصر، ۱۹۵۶ء،ص۳۴۴-۳۴۸

۶۔ انیس المقدسی، الاتجاہات الأدبیۃ فی العالم العربی الحدیث، بیروت ۱۹۸۸ء،ص۳۵-۳۸

۷۔ میخائیل نعیمۃ، السبعون، ثلاثۃ اجزاء، دارصادر بیروت، ۱۹۵۹ء/ ۱۹۶۰ء

۸۔ طہ حسین، الأیام، الجزء الاول والثانی، دارالمعارف، مصر، ۱۹۵۵ء

۹۔ احمد شفیق، مذکراتی فی نصف قرن، القاہرہ، ۱۹۳۴ء

۱۰۔ قصۃ حیاتی، احمد لطفی السید، دارالہلال، قاہرہ ۱۹۶۲ء

۱۱۔ مذکرات کرد علی، مطبعۃ الترقی، دمشق ۱۹۴۸ء، ج۱،ص۳

۱۲۔ عبدالرحمان الرافعی، مذکراتی، دارالہلال، ۱۹۵۲ء،ص۳

۱۳۔ بدرالدین الحافظ، چند مصری ناول اور افسانے، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۶ء،ص۱۴۰

۱۴۔ محمد حسین ہیکل، زینب، ۱۹۵۹ء

۱۵۔ عودۃ الروح، قاہرہ، ۱۹۶۷ء

۱۶۔ الشعبۃ، قاہرہ، ۱۹۷۰ء

۱۷۔ طاہر الطناجی، عصامیون عظماء من الشرق والغرب، دارالہلال، ۱۹۴۴ء

۱۸۔ حسین فوزی، سندباد فی رحلۃ الحیاۃ، دار المعارف، ۱۹۶۸ء

۱۹۔ الشابی، مذکرات الشابی، دار التونسیۃ للنشر، ۱۹۶۶ء

۲۰۔ دارالکاتب العربی للنشر والطباعۃ (ب ت)

۲۱۔ مکتبۃ الآداب، قاہرۃ (ب ت)

☆☆☆

بحث ونظر

معاشی تحفظ کے لیے نبوی اقدامات

——————— ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

معاشی تحفظ سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان کی بنیادی ضروریات آسانی پوری ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہ فاقوں سے مرنے لگے اور بنیادی ضروریات کی عدم فراہمی کی وجہ سے خودکشی پر مجبور ہوجائے۔ سماج کے ہر انسان کو یہ تحفظ فراہم کرنا معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اسلام نے روز اول سے بنیادی انسانی حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے اس سلسلے میں خصوصی احکام دیے۔ اس نے معاشی سرگرمیوں کی انجام دہی پر بہت زور دیا اور فرائض کے بعد طلبِ حلال کی جستجو کو فرض قرار دیا۔[۱] احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فقر و فاقہ سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ یہاں آپؐ کی ایک دعا پیش کی جارہی ہے:

اللھم انی اعوذبک من الفقر والقلة والذلّة[۲]	اے اللہ میں فقر، (اعمال خیر کی) قلّت اور ذلّت سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقر انسان کو کفر اور ذلت کے مقام تک پہنچا دیتا ہے اور یہ بھوک اور غربت ہی ہے جو معاشرہ کو اخلاقیات سے عاری کردیتی ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے کسی نے افضل عمل کا سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا: الصلوۃ والخبز (نماز اور روٹی) سائل حیران ہوا تو انھوں نے نے فرمایا: ویحک لولا الخبزُ ماعبداللّٰہ[۳] (تیرا برا ہو۔ اگر روٹی نہ ہو تو اللہ کی عبادت بھی نہ کی جائے)۔

معاشی عدم تحفظ کے نتیجہ میں باہم محبت والفت ختم ہوجاتی ہے اور معاشرہ انارکی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ان وجوہ سے تعلیمات نبوی میں معاشرتی اور ریاستی سطح پر متعدد اقدامات کیے گئے، تاکہ معاشرہ کے افراد- بیوہ، یتیم، مفلوک الحال، دیگر کمزور طبقات اور سرکاری ملازمین- اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کرسکیں۔

معاشرتی سطح پر اقدامات

کم زور طبقات کی حاجت روائی کے لیے رسول اللہ ﷺ نے معاشرہ میں جن اقدامات کی تلقین فرمائی، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(الف) کسب معاش کی تلقین

نبی کریم ﷺ نے بے کاری اور کسل مندی کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ کارگاہ حیات میں مومن کے مشغول رہنے کو پسند کیا۔ قرآن کریم نے بندہ مومن کی مشغولیت کو عمل صالح سے تعبیر کیا ہے۔ عمل صالح کی وضاحت مولانا حمید الدین فراہی نے ان الفاظ میں کی ہے: ''جو انسان کے لئے زندگی اور نشو ونما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعے سے انسان ترقی کے ان اعلی مدارج تک پہنچ سکے جو اس کی فطرت میں ودیعت ہیں''۔[۴]

معاشی سرگرمی اتنا اہم عمل صالح ہے کہ اسے قرآن میں فضل اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلوٰةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ۔ (الجمعۃ:۱۰)	پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اسی طرح قرآن کریم میں رزق حلال کے لیے کسب وسعی کرنے والوں کا تذکرہ مجاہدین فی سبیل اللہ کے ساتھ کیا گیا ہے:

وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. (المزمل:۲۰)	دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں رزق حلال کے لیے جدوجہد کا مقام بڑا اونچا ہے۔

قرآن کریم میں تقریباً ۳۶۰/ آیات ہیں جن میں عمل صالح کی اہمیت، عامل کی مشغولیت اور جزا، کا ذکر ہے۔ اس میں کسب معاش کے لیے ایک مومن کی سعی و جہد بھی آسکتی ہے۔

اس ضمن میں ہمارے سامنے نبی کریم ﷺ کا عملی نمونہ بھی ہے۔ آپ نے چند قرار یط

پر قبل نبوت اہل مکہ کی بکریاں چرائیں۔۵ مسجد نبوی کی تعمیر میں عملاً شریک ہوئے۔ غزوۂ احزاب میں خندق کی کھدائی میں حصہ لیا۔ آپ خود گھر کی صفائی فرما لیتے، اونٹ کو باندھ لیتے اور اپنے جانور کو چارہ بھی دیتے، خدمت گار کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، آٹا گوندھنے میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور بازار سے سودا بھی لے آتے۔۶

آپؐ نے اپنے ارشادات میں رزقِ حلال کے لیے کسب وسعی کی تلقین فرمائی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کسی کا رسی لے کر جنگل جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے۔۷ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر لاد کر لائے تو یہ سوال کرنے سے بہتر ہے''۔۸

صحابۂ کرام نے آپ کے اسوۂ حسنہ کا مشاہدہ کیا اور آپ کے ارشادات کو سنا تو ان کی حالت یہ ہوگئی کہ کسل مندی اور بے کاری کے ایام گزارنا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے جب کثرت روایات کا سبب دریافت کیا گیا تو انھوں نے صحابہ کی مشغولیات ومصروفیات کی طرف اجمالاً اشارہ کیا۔ انھوں نے مہاجرین کے بارے میں فرمایا کہ وہ بازار میں مشغول رہتے ہیں اور انصار کے بارے میں بتایا کہ وہ کھیتوں اور باغات میں کام کرتے ہیں۔۹ صحیح بخاری میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے کاروبار، حضرت ابوبکرؓ کی تجارت اور حضرت عمرؓ کی بازار میں مشغولیت کا ذکر ہے۔۱۰ مفتی محمد شفیعؒ نے سورۃ النور آیت ۳۷ کی تفسیر میں صحابہ کے طرز معیشت کے بارے میں لکھا ہے: ''اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام زیادہ تر تجارت پیشہ یا صنعت پیشہ تھے''۔۱۱ امام بخاری نے حدّاد (لوہار)، خیّاط (درزی)، نسّاج (کپڑا بننے والا)، نجّار (بڑھی)، صائغ (سنار) سے متعلق مختلف روایات نقل کی ہیں، جو انسان کو کسب وسعی کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔۱۲ ہمارے ائمہ کے ناموں کے ساتھ مختلف پیشوں کی نسبتیں (جیسے بزّاز، قفّال، جصّاص، قطّان وغیرہ) بھی ظاہر کرتی ہیں کہ علم وعمل کی ان بلند شخصیتوں نے عمل صالح کا کیسا جامع تصور لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ امام شعرانیؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ درزی اپنی سوئی کو اور بڑھئی اپنی آری کو تسبیح بنا لے۔۱۳

تعلیمات نبوی نے ان تصورات ونظریات کی بیخ کنی کردی جو انسان کے کسب وسعی

میں رکاوٹ بنتے ہیں:

۱۔ ایک رکاوٹ توکل علی اللہ کی غلط تعبیر وتشریح ہے۔ آپؐ کی تعلیمات کی روشنی میں توکل کا مطلب ہے کسب وسعی اور نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ نا نہ کہ کسب وسعی سے دستبردار ہونا۔

۲۔ آپؐ نے ترک دنیا کو انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا، محنت ومشقت کر کے رزق حلال کمانے کو عبادت میں شمار کیا اور حسنات آخرت کے ساتھ حسناتِ دنیا طلب کرنے کی تلقین کی۔

۳۔ آپ نے عملاً خود مختلف کاموں میں حصہ لے کر یہ واضح کر دیا کہ سوسائٹی میں کسی کا بلند مقام ومرتبہ کسب وسعی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔

(ب) صدقات:

اسلامی تعلیمات میں صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کے ذریعہ بھی معاشی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی کسی سائل کو منع نہیں فرمایا۔[۱۴] ایک دفعہ ایک ہی مجلس میں ستر ہزار درہم تقسیم فرما دیئے۔[۱۵] امت میں آپ نے قابل رشک اسے قرار دیا جو اپنا مال راہ حق میں خرچ کرتا ہے۔[۱۶] حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے ابن آدم خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا''۔[۱۷] آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے: ''خرچ کرو، گن گن کر نہ دو، ورنہ اللہ بھی تم کو گن گن کر دے گا اور جمع کر کے نہ رکھو، ورنہ اللہ بھی تمہارا حصہ جمع کر کے رکھے گا''۔[۱۸]

آپؐ نے اہل وعیال پر خرچ کو بھی صدقہ قرار دیا، کیونکہ کسی بھی انسان کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو معاشی تحفظ فراہم کرے۔ اسی طرح رشتہ داروں پر خرچ کرنے کی بھی تاکید کی۔[۱۹]

صدقہ کے درج ذیل معاشی پہلو قابل توجہ ہیں:

۱۔ صدقہ خالصتاً دینی کام ہے، لیکن اُخروی نعمتوں کے ساتھ یہ معاشی بہبود بھی لاتا ہے۔ اس کی مثال صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک آدمی کی زمین کو بادل سیراب کرتے ہیں۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ وہ باغ کی پیداوار کے تین حصے استعمال کرتا ہے

اور ایک حصہ صدقہ کر دیتا ہے۔[۲۰]

۲۔ صدقہ جرائم سے چھٹکارے کا ذریعہ بنتا ہے اور کسی معاشرہ میں پرامن اور جرائم سے پاک ماحول معاشی تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس کی مثال صحیحین کی وہ حدیث ہے جس میں ایک ایسے آدمی کا ذکر ہے جو چور اور زانیہ کو صدقہ دے دیتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے یہ صدقہ چور کو چوری اور زانیہ کو بدکاری سے روک دے۔[۲۱]

۳۔ حضرت حسن بصری کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے مریضوں کا صدقہ سے علاج کرو''۔[۲۲]

(ج) ہدایا و تحائف

ہدیہ دینے سے محبت بڑھتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہدیہ سے دوسرے فرد کو معاشی تحفظ فراہم ہوتا ہے۔ عہد نبوی میں تحائف میں دی جانے والی چیزوں پر غور کریں تو وہ بنیادی انسانی ضروریات کے زمرے میں آتی ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱۔ صحابہ بارگاہِ رسالت میں دودھ، کھجور اور طعام کے ہدایا پیش کرتے تھے۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر مسلموں کو کھانے کے تحائف بھیجتے تھے۔

۳۔ آپؐ کی خدمت میں ملبوسات کے تحائف بھی ارسال کئے جاتے تھے۔[۲۳]

تحائف و ہدایا کی یہ روایات بتاتی ہیں کہ افراد کی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے یہ ایک اہم اور کارگر اصول تھا۔

(د) عاریتاً چیز دینا

عاریتاً چیز دینے سے بھی معاشی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو، جو برتنے کی معمولی چیزیں بھی ادھار نہیں دیتے، بربادی کا پیغام دیا ہے۔ (الماعون: ۷) 'ماعون' ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ مفسرین کے نزدیک اس میں زکوۃ سے لے کر چھلنی، ڈول، سوئی، کلہاڑی، ہنڈیا، نمک، دیا سلائی تک کی عام اشیائے ضرورت شامل ہیں۔ اسی طرح اس کی تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ کسی کے ہاں مہمان آجائیں اور وہ ہمسائے سے

چارپائی یا بستر مانگ لے یا کوئی اپنے ہمسائے کے تنور میں اپنی روٹی پکا لینے کی اجازت مانگے یا کچھ دنوں کے لئے باہر جارہا ہو اور کوئی قیمتی سامان دوسروں کے پاس رکھوانا چاہے۔۲۴

عہدِ رسالت مآبؐ میں عام روزمرہ زندگی میں چیزیں مستعار لینے کا پتا چلتا ہے:

۱۔ خواتین کے، ملبوسات مستعار لینے کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ حضرت عائشہ دوسروں کو اپنی چیزیں بالخصوص قمیص مستعار دیا کرتی تھیں۔ دلہن کے کپڑے مستعار لینا معمول تھا اور اسے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔۲۵ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اگر کسی عورت کے پاس چادر نہ ہو تو وہ اپنی کسی بہن سے ادھار لے لے''۔۲۶

۲۔ عورتوں کے زیورات مستعار لینے کی بھی روایت تھی۔ غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر حضرت عائشہ کا گم ہونے والا ہار دراصل ان کی بہن حضرت اسماء کا تھا، جسے انھوں نے ان سے مستعار لیا تھا۔۲۷

۳۔ نبی کریم ﷺ نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ جس کے پاس اس کی ضرورت سے زائد زمین ہو وہ اسے اپنے کسی بھائی کو ہبہ کردے یا اسے عاریتاً دے دے۔۲۸

عاریتاً چیزیں دینے کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے فقہی زبان میں یوں بیان کیا ہے: ''امت کا اس پر اجماع ہے کہ عاریت نہ صرف جائز ہے، بلکہ مستحسن ہے اور مستحب بھی ہے، اس لئے کہ اس میں مجبور کی حاجت روائی اور نادار کی اعانت و امداد ہے''۔۲۹

(ہ) ہنگامی چندہ

حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک ایسی جماعت حاضر ہوئی جو برہنہ پا اور ننگے بدن تھی، یعنی وہ ناداری کے سبب انتہائی خستہ حال تھے۔ انھوں نے چیتے کی کھال کی طرح کا عبا اوڑھ رکھا تھا، تلواریں لٹکا رکھی تھیں۔ ان کی اکثریت قبیلہ مضر سے تعلق رکھتی تھی، بلکہ سب ہی قبیلہ مضر کے افراد تھے۔ ان کے چہروں پر فاقہ کشی کے نمایاں آثار دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ انور سرخ ہوگیا۔ آپؐ حجرہ مبارک میں تشریف لے گئے، پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ چناں چہ

اذان واقامت کے بعد نماز ادا فرمائی۔ اس سے فراغت کے بعد لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں آپؐ نے صحابہ کو صدقہ وخیرات پر ابھارا۔ آپؐ کی پرتاثیر تقریر سن کر صحابہ نے اپنی جمع پونجی آپؐ کے قدموں میں ڈھیر کردی۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آن کی آن میں اناج اور کپڑوں کے دو انبار لگ گئے۔ ایک انصاری صحابی نے درہموں سے بھرا ہوا ایک طبق پیش کیا، جو اتنا وزنی تھا کہ ان سے اٹھایا نہ جاتا تھا۔ اس ترغیبی اور ہنگامی چندے سے حاصل شدہ مال کو دیکھ کر اور صحابہ کے ایثار سے خوش ہوکر نبی اکرم ﷺ کا چہرۂ انور دمکنے لگا۔[۳۰] یہ تمام اشیاء آپؐ نے قبیلہ مضر والوں کے درمیان تقسیم فرمادیں۔

معاشی تحفظ کے لیے عملی اقدامات

نبی کریم ﷺ نے اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ایسے عملی اقدامات بھی کئے جو مختلف حوالوں سے امت کے لئے راہنمائی کا سامان ہیں۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے اعلان نبوت سے قبل کی آپؐ کی زندگی کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی حیات مبارکہ دوسرے انسانوں کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ معاشی تحفظ کے لیے آپؐ کے چند عملی اقدامات درج ذیل ہیں:

(الف) حلف الفضول میں شرکت

آپؐ کی عمر مبارک ۲۰ سال تھی جب آپؐ نے حلف الفضول میں شرکت فرمائی۔ اس کا مقصد پرامن معاشرہ کا قیام اور بقائے باہمی کے اصولوں پر زندگی گزارنا تھا۔ ان اصولوں سے معاشی تحفظ بھی حاصل ہوا۔ حلف الفضول کی ایک شق یہ بھی تھی:

لنکوننّ مع المظلوم حتی یُؤدی الیه حقه مابلّ بحر صوفة، وفی التأسّی فی المعاش۔[۳۱]

ہم ہمیشہ مظلوم کی مدد کریں گے، یہاں تک کہ اسے اس کا حق مل جائے اور معاش میں ہم خبرگیری اور مواسات بھی کریں گے۔ یہ معاہدہ اس وقت تک ہے جب تک سمندر گھونگھے کو تر کرتا رہے۔

(ب) اصحاب صفہ کی کفالت وتربیت

صفّہ کی درس گاہ سے ہمیں مندرجہ ذیل معاشی تعلیمات ملتی ہیں:

۱۔ اصحابِ صفّہ کی کفالت کی فکر اوراس کے لیے عملی طور پر کوششیں کرکے آپؐ نے ثابت کردیا کہ فقراءاورمحتاجوں کی معاشی کفالت اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ جوصدقہ کا مال یا کھانا آپؐ کی خدمت میں پیش کیا جاتا وہ آپ ان فقراء کو بھجوادیتے۔ اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ صدقات فقراء کے لیے ہیں اوروہ ان کی کفالت کا ذریعہ ہیں۔

۳۔ مال دار انصارصحابہ اصحاب صفہ میں سے دودوتین تین کوکھانا کھلایا کرتے تھے۔اس سے اشارہ ملتا ہے کہ اغنیاء کے مال ودولت میں محتاجوں کا بھی حق ہے۔

۴۔ صاحب استطاعت انصار کا فقراء کی کفالت کرنا بتاتا ہے کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ محتاجوں کی نگہداشت کرنا صاحب استطاعت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

۵۔ اصحاب صفّہ میں سے ایک ٹولی کا باری باری جنگل جاکرلکڑیاں چن کرلانا اورانھیں فروخت کرکے اپنی معاش کاانتظام کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرہ کا ہرصحت مند اورجسمانی طور پر قابل کارشخص اپنی اوراپنے اہل وعیال کی کفالت کے لئے کوشش کرے گااورکوئی نہ کوئی جائز پیشہ ضروراختیار کرے گا۔اگر پھربھی وہ اپنی ضروریات زندگی پوری نہیں کرسکے گا تو پھراس کی کفالت اسلامی معاشرہ اوراسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔

۶۔ صفہ کی درسگاہ کی حیثیت اس دور کی اقامتی یونیورسٹی (Residential University) جیسی تھی، جہاں پراصحاب صفہ (مسافر ومساکین طلبہ) زیورتعلیم سے آراستہ ہوتے تھے۔آپؐ کا اپنے علاوہ دوسرے معلمین کوبھی اس کام کے لئے مقررکرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔

معاشی ترقی (Economic Development) میں تعلیمی پہلو (Educational Factor) کی جو اہمیت ہے اس کوتمام ماہرین معاشیات (Economists) نے تسلیم کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دور میں یہ اہم کام کر کے دکھایا۔

۷۔ صفہ کی اس درس گاہ میں دراصل آپؐ انسانی سرمایہ (Human Capital) تیار فرمارہے تھے۔ انسانی سرمایہ معاشی ترقی کے لیے مالی سرمایہ (Money Capital) سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے۔[۳۲]

(ج) مواخاۃ

مواخاۃ کے معاشی مضمرات (Economic Implications) تو بے شمار ہیں، مگر ان میں سے چند، جن تک بادی النظر میں بھی رسائی حاصل ہوجاتی ہے، مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مہاجرین کی معاشی کفالت کا سامان ہوگیا اوراس سے متعلقہ معاشی مسائل (Economic Problems) حل ہوگئے۔

۲۔ قلیل عرصہ میں مہاجرین کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (Basic Needs) کے اسباب فراہم ہوگئے۔

۳۔ وقتی بے روزگاری (Unemployment) کا علاج تلاش کرلیا گیا۔ تقریباً تمام قابل کار مہاجرین انصار کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوگئے۔

۴۔ معاشی وسائل (Economic Resources) کا مناسب استعمال (Proper Utilization) کرلیا گیا۔ انصار کی وہ زمینیں جو اب تک زیر کاشت نہیں لائی گئی تھی انہیں قابل کاشت بنایا گیا۔ ان کے کھجور کے باغات اور نخلستانوں کی مناسب دیکھ بھال کی گئی۔ لہٰذا ان کی پیداوار بڑھی اور آمدنی میں اضافہ ہوا۔ جس کا نتیجہ معاشی خوش حالی (Economic Welfare) کی صورت میں ظاہر ہوا۔

۵۔ دو خاندانوں کو ایک خاندان بنا دیا گیا اور یوں اخراجات میں کمی ہوئی۔ الغرض نبی کریم ﷺ نے اپنی فراست نبوی سے کام لے کر انصار اور مہاجرین کے درمیان ایسا نظام مواخاۃ قائم فرمایا جس سے روزگار کے مواقع بڑھے اور معاشی ترقی کی راہیں کھلیں۔[۳۳]

(د) میثاق مدینہ

میثاق مدینہ منورہ کے ذریعے آپؐ نے مسلمانوں کے لئے بہت سے معاشی فوائد کا حصول آسان بنادیا۔مثلاً:

۱۔ اس معاہدہ کے ذریعے نہ صرف مہاجرین مکہ مکرمہ کے معاشی تعلقات انصار مدینہ کے ساتھ مستحکم ہوئے اورانہیں قانونی شکل ملی، بلکہ مسلمان انصاریا مہاجرین جو اس وقت جماعت بن چکے تھے،ان کے معاشی تعلقات یہود مدینہ اور دیگر قبائل کے ساتھ طے پا گئے۔ اب وہ اس قابل ہوگئے تھے کہ آپس میں ایک دوسرے سے معاشی اشیاء (Economic Goods) کا تبادلہ کر کے اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کرسکیں۔

۲۔ ہجرت مدینہ منورہ کے بعد اور میثاق مدینہ منورہ کے طے پاجانے سے قبل مسلمان مہاجرین یا انصار مدینہ منورہ اورآس پاس کے دیگر قبائل کے ساتھ حالت جنگ میں تھے۔لہٰذا ان پر ایک خوف کی سی کیفیت کا طاری رہنا فطری تھا۔ایسے حالات میں معاشی ترقی یا خوشحالی (Economic Welfare) کا عمل رک جاتا ہے، جو ملک اورقوم کے لئے پستی اور پریشانی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پیغمبرانہ فراست سے کام لے کر مسلمان اورغیر مسلم قبائل کواس معاہدہ کے ذریعے امن مہیا فرمادیا،جس کے طفیل تمام جماعتیں اپنی معاشی خوش حالی کی فکر کرسکتی تھیں۔

۳۔ میثاق مدینہ منورہ کی دفعات میں سے ایک نمایاں دفعہ یہ تھی کہ مدینہ منورہ پرحملہ کی صورت میں،خواہ وہ حملہ مدینہ منورہ کے تمام قبائل (مسلمان، یہوداور مشرکین) کے خلاف ہو یا میثاق کوتسلیم کرنے والے کسی ایک قبیلہ یا جماعت (مسلمان ہو یا یہود) کے خلاف ہو،تمام اہل مدینہ دفاعی اخراجات برداشت کریں گے۔اس طرح آپؐ نے غریب مسلمانوں کی اُس معاشی کمزوری کا علاج کردیا جوانہیں اکیلے مصارف جنگ برداشت کرنے سے ہوتی، کیونکہ دراصل یہی تووہ اہل وفا تھے جوتمام قبائل عرب کی آنکھوں میں خاربن کرکھٹک رہے تھے۔ یہودسرمایہ داروں کواس معاہدہ کے ذریعہ دفاعی اخراجات میں شریک کرکے آپؐ نے مسلمانان مدینہ منورہ

کی ایک بہت بڑی پریشانی کو حل کردیا۔ جو آپ کی معاشی بصیرت (Economic Insightment) کی دلیل ہے۔[۳۴]

ریاست کی ذمہ داری

ان اقدامات کے ساتھ ریاست کو بھی اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی معاشی ضرورتوں کے لئے اہتمام کرے۔ اسلامی ریاست کی حیثیت ولی کی ہے۔ اگر کوئی مقروض فوت ہوجائے تو اس کا قرض ادا کرنا بھی ریاست کے ذمہ ہوگا۔ چند ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

فالامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیته [۳۵]	لوگوں کا امام ان کا نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔
مامن امیر یلی امر المسلمین ثم لایجهد لهم وینصح لهم الالم یدخل معهم الجنة [۳۶]	جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا امیر بن کر ان کے لئے جدوجہد اور خیر خواہی نہ کرے وہ ان کے ساتھ جنت میں بھی داخل نہ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے سرکاری ملازمین کے لئے سہولیات کا اعلان فرمایا، تاکہ وہ دلجمعی سے سرکاری کام انجام دے سکیں۔ ملازمین کے معاشی تحفظ کے حوالے سے آپؐ کا درج ذیل ارشاد ارباب اقتدار کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجة فان لم یکن خادم فلیکتسب خادما وان لم یکن له مسکن فلیکتسب مسکنا [۳۷]	جو کوئی ہمارا ملازم ہو تو وہ سرکاری خرچ پر شادی کرسکتا ہے اور اگر اس کے لئے خادم نہ ہو تو ایک خادم لے سکتا ہے اور اگر اس کی رہائش نہ ہو تو وہ گھر لے سکتا ہے۔

معاشی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے معاشرتی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر امن وامان قائم رکھنے کے لئے آپؐ نے متعدد عملی اقدامات فرمائے۔ قرآن کریم نے امن و امان اور معاشی سرگرمیوں کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔ آپ نے مدینہ منورہ کو حرم قرار دے کر امن

وسلامتی کا ایک ماڈل ہمارے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے مومن اور عام انسان کی جان، مال اور عزت کے تحفظ کو اہم قرار دیا۔

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات اور عملی اقدامات اس بات کا مظہر ہیں کہ ایک پرامن معاشرہ، جس میں مسلم و غیر مسلم سبھی معاشی ضرورتوں سے آزاد ہو کر ملک کی فلاح کے لئے کام کریں، اس کو معاشی تحفظ فراہم کرنا افراد معاشرہ اور ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس معاشرہ میں اگر کسی کو معاشی دشواری لاحق ہوگی تو وہ پریشان نہیں ہوگا، بلکہ اسے یہ احساس ہوگا کہ معاشرہ کے دیگر افراد فوراً اس کی اعانت اور دستگیری کے لیے لپکیں گے۔

حواشی ومراجع

۱ طلبُ کسب الحلال فریضة بعد الفریضة، بیهقی، شعب الایمان:۸۷۴۱

۲ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فی الاستعاذۃ،۱۵۴۴

۳ سرخسی، المبسوط، جلد۳۰،ص:۲۶۵

۴ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، فاران فاونڈیشن لاہور،۱۹۸۰، جلد۸،ص:۵۳۶

۱۲ صحیح البخاری، کتاب الاجارۃ، باب رعی الغنم علی قراریط،۲۲۶۲

۱۳ ابوالحسن علی ندوی، نبی رحمت، ادارہ نشریات اسلام کراچی،ص:۵۹۹

۷ صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ،۲۰۷۴

۸ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھۃ المسالۃ للناس،۱۰۴۲

۹ صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول اللہ تعالیٰ،۲۰۴۷

۱۰ ایضاً، باب: ماذکر فی الاسواق،۲۰۷۰

۱۱ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی،۱۹۸۹، جلد۶،ص۴۳۰

۱۲ ملاحظہ فرمائیے صحیح بخاری کی کتاب البیوع

۱۳ یوسف، القرضاوی، اسلام اور معاشی تحفظ، مترجم: عبدالحمید صدیقی، البدر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۸،ص:۴۴

۱۴ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخاء، ۶۰۳۴

۱۵ اخلاق النبی وآدابہ، جلد اول، ص: ۲۹۷، ۹۵

۱۶ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ، ۷۳

۱۷ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحثّ فی النفقۃ، ۹۹۳

۱۸ ایضاً، باب الحثّ علی الانفاق، ۱۰۲۹

۱۹ ایضاً، باب فضل الصدقۃ علی الاقربین والزوج، ۹۹۸

۲۰ ایضاً، کتاب الزھد والرقائق، باب الصدقۃ فی المساکین،، ۲۹۸۴

۲۱ صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب: اذا تصدق علی غنی ۱۴۲۱؛ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب: ثبوت اجر المتصدق، ۱۰۲۲

۲۲ صحیح الترغیب والترہیب، ۷۴۴؛ علامہ البانی نے اسے حسن لغیرہ کہا ہے۔

۲۳ ان تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی، عہد نبوی کا تمدن، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء ص: ۲۲۱-۲۳۰، ۲۳۱ ومابعد، ۳۸۴ ومابعد

۲۴ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ادارۂ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۲ء جلد ۶، ص: ۴۸۶

۲۵ عہد نبوی کا تمدن، ص: ۳۹۷، ۳۹۸

۲۶ سنن الترمذی، باب فی خروج النساء فی العیدین

۲۷ عہد نبوی کا تمدن، ص: ۵۳۶

۲۸ صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب کراء الارض

۲۹ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، اسلام کا اقتصادی نظام، مکتبہ لاہور، ۱۹۹۵، ص: ۳۲۶

۳۰ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب: الحثّ علی الصدقۃ، ۱۰۱۲/ اس اقتباس اور اس طرح کی دیگر مثالوں کے لئے دیکھئے، مفتی عمران الحق کی کتاب 'الکفالہ والنفقات' مطبوعہ دارالاشاعت کراچی، ص: ۸۱ ومابعد

۳۱ طبقات ابن سعد

۳۲ ڈاکٹر نور محمد غفاری، نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ

لاہور،ص:۱۷۴-۱۷۵

۳۳ ایضاً،ص:۱۷۰-۱۷۱

۳۴ ایضاً،ص:۱۸۲-۱۸۳

۳۵ صحیح البخاری: ۱۳۸۷؛ صحیح مسلم: ۱۸۲۹

۳۶ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب استحقاق الوالی الغاش، ۱۴۲

۳۷ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب فی ارزاق العمال، ۲۹۴۵

☆☆☆

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

ہندوستان کے پس منظر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ موضوع کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس لیے کہ فرقہ پرستوں نے اس سلسلہ میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ پروپیگنڈا کیا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو موجبِ گردن زنی قرار دیتا ہے اور اس میں مذہبی رواداری اور توسّع نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کی مذہبی آزادی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاشرتی، معاشی اور سیاسی تعلقات پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف کے جاندار اور رواں دار قلم نے سلیس اور دلکش اسلوب میں پیچیدہ مسائل کی گتھی سلجھائی ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی مفصل کتاب، دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک اہم ضرورت

آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات: ۳۳۲ قیمت (مجلّد) =/۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

والدین کے ساتھ حسن سلوک☆

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)

——————ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

انسان کا اپنے رشتہ داروں میں سب سے قریبی تعلق والدین سے ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اس دنیا میں اس کے وجود کا ذریعہ بنتے ہیں، بلکہ پیدائش کے بعد اسے پال پوس کر بڑا کرتے اور مکروہاتِ زمانہ سے بچاتے ہوئے زندگی کی دوڑ دھوپ میں شامل ہونے کے قابل بناتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں والدین کا تذکرہ رشتہ داروں سے قبل کیا گیا ہے اور ان کی خصوصی اہمیت کی وجہ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم علیٰحدہ سے دیا گیا ہے:

وَاعْبُدُواْ اللّـهَ وَلاَ تُشْرِكُواْ بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِيْ الْقُرْبَى ..... ۔ (النساء:۳۶)

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ..... ۔

قرآن کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل سے جب مکمل اطاعت کا عہد لیا گیا تھا تو انھیں بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی تھی:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ لاَ تَعْبُدُونَ إِلاَّ اللّـهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَذِيْ الْقُرْبَى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ۔ (البقرۃ:۸۳)

یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا..... ۔

☆ تسلسل کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ 'بوڑھوں کے عافیت کدے اور اسلام'، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل- جون ۲۰۱۲ء

درج بالا دونوں آیتوں میں سب سے پہلے اللہ واحد کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے رشتہ داروں اور سماج کے دیگر افراد کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو کہا گیا ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید

سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات زیادہ زوردار انداز میں کہی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ (بنی اسرائیل:۲۳)	تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

اس آیت میں بلاغت کے متعدد پہلو پوشیدہ ہیں:

آیت کا آغاز لفظ 'قضیٰ' سے کیا گیا ہے۔ اس میں کسی چیز کے بہت تاکید کے ساتھ حکم دینے کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔ علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے:

(وَقَضٰى رَبُّكَ) وامر امرا مقطوعا به[۱]	وَقَضٰى رَبُّكَ کا مطلب یہ ہے کہ تیرے رب نے قطعی طور سے اس چیز کا حکم دیا ہے۔

قرطبیؒ فرماتے ہیں:

قضى اى امر والزم واوجب[۲]	قضیٰ کا مطلب ہے کہ اس کا حکم دیا، اس کو لازم کیا اور اس کو واجب قرار دیا۔

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، پھر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ ان دونوں حکموں کے درمیان متعدد مناسبتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی مناسبت یہ ہے کہ انسان کے وجود کا سبب حقیقی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کی ہے اور سبب ظاہری یہ ہے کہ والدین اس کا ذریعہ بنے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے سببِ

حقیقی کی تعظیم کا، پھر سببِ ظاہری کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ محسن و منعم کی شکرگزاری واجب ہوتی ہے اور منعم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، جو خالق ہے اور مخلوق میں سے سب سے بڑا احسان انسان پر اس کے والدین کا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے خالق کے احسان پر شکر بجالانے کا حکم دیا، پھر والدین کے احسان پر ان کی شکرگزاری کی تلقین کی۔[۳]

اس آیت میں اور خاص طور پر اس کے الفاظ 'وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً' میں متعدد پہلوؤں سے بڑی بلاغت اور زور بیان پایا جاتا ہے:

۱- اس سے پہلے کی آیت میں اخروی سعادت کا تذکرہ ہے اور اس آیت میں ان اعمال کا ذکر کیا گیا ہے جو اخروی سعادت سے ہم کنار کرنے والے ہیں۔ ان میں سے ایک والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے۔

۲- آیت میں پہلے توحید اور اطاعتِ الٰہی کا بیان ہے، اس کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا درجہ کتنا بلند ہے۔

۳- لفظ 'والدین' کو لفظ 'احساناً' سے پہلے لانے سے اس میں تاکید اور زور پیدا ہوگیا ہے۔

۴- لفظ 'احساناً' کو نکرہ لایا گیا ہے، جو عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے کہ والدین کے ساتھ بہت زیادہ اور کامل طریقے سے حسن سلوک کرو۔ کیوں کہ جس طرح ان دونوں نے تمہارے ساتھ احسانِ عظیم کیا ہے اسی طرح تمہارا بھی ان کے ساتھ معاملہ ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود تم ان کا بدلہ پورا پورا نہیں چکا سکتے، اس لیے کہ ان کا احسان تمھارے ساتھ پہلے ہوا ہے اور مثل مشہور ہے کہ پہلے احسان کرنے والے کا بدلہ نہیں چکایا جاسکتا۔[۴]

قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ۔ (لقمان:۱۴)

اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا۔ میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَاناً حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهاً وَوَضَعَتْهُ كُرْهاً وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْراً۔ (الاحقاف:۱۵)

ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔

ان آیات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، جس میں ماں باپ دونوں شامل ہیں، اگرچہ ماں کی تکلیفوں اور مشقتوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ وہ دورانِ حمل بھی مشقت جھیلتی ہے، وضع حمل کے دوران بھی شدید اذیت سے دوچار ہوتی ہے اور پھر پیدائش کے بعد عرصہ تک دودھ پلاتی ہے۔ اسی لیے بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا درجہ باپ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے۔

ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: تمھاری ماں۔ یہ سوال انھوں نے تین بار دہرایا۔ آپؐ نے ہر بار یہی جواب دیا۔ یہی سوال انھوں نے چوتھی بار کیا تو آپؐ نے فرمایا، تمھارا باپ۔[۵]

بوڑھے والدین کے ساتھ حسنِ معاملہ کا خصوصی حکم

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا یہ حکم عام ہے۔ لیکن جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے حقوق ادا کرنے، ان کی دیکھ بھال کرنے اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنے کا خصوصی حکم دیا گیا ہے۔ بڑھاپا اپنے ساتھ متعدد عوارض لے کر آتا ہے۔ انسان کے

جسمانی قویٰ کم زور ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں کی انجام دہی میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ بسا اوقات مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ہے، چنانچہ طبیعت کے خلاف کوئی معمولی کام ہوجائے تو سخت ناگواری ہوتی ہے اور غصہ آجاتا ہے۔ ایسے موقع پر اولاد کی سعادت مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان کے دست و بازو بنیں، انھیں سہارا دیں، ان کے کام انجام دیں، ان کی ضروریات پوری کریں، ان کی تنک مزاجی کو برداشت کریں۔ احادیث میں بوڑھے والدین کی خدمت کا درجہ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر قرار دیا گیا ہے۔

ایک شخص نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں جہاد کے لیے نکلنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تمھارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: **فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ** (ان کے ساتھ رہ کر جہاد کرو)[۶] ساتھ رہ کر جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت کرو۔

ایک دوسری روایت میں، جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے، یہ مذکور ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: میں اللہ تعالیٰ سے اجر کی طلب میں آپ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمھارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں دونوں زندہ ہیں؟ آپؐ نے اس شخص سے پھر سوال کیا: کیا تم اللہ سے اجر کے طالب ہو؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا:

فارجع الی والدیک فاحسن صحبتھما۔[۷]	تب اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ اور ان کی اچھی طرح خدمت کرو۔

جس شخص کو اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کی توفیق ملی ہو اسے جنت کی بشارت دی گئی ہے اور جس شخص نے انھیں بڑھاپے میں پایا ہو، پھر بھی ان کی خدمت نہ کی ہو اسے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: **رغم انفہ** (اس شخص کی ناک غبار آلود ہوئی، یعنی وہ ناکام و نامراد ہوا) حاضرین نے دریافت کیا: کون؟ اے اللہ کے رسول ﷺ۔ آپؐ نے جواب دیا:

من ادرک ابویہ عند الکبر او احدھما ثم لم یدخل الجنۃ۔[8]	جس نے اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر بھی جنت میں داخل نہ ہوسکا۔

الادب المفرد میں اس حدیث کا آخری ٹکڑا 'فدخل النار' کے الفاظ سے ہے، یعنی پھر بھی جہنم میں چلا گیا۔[9]

قرآن کریم کا دل کش بیان

بوڑھے والدین کے ساتھ جس طرح کا رویّہ مطلوب ہے اور ان کے ساتھ جس طرح پیش آنا چاہیے، اس کی بڑی موثر تفصیل قرآن کریم میں ایک جگہ ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً۔(بنی اسرائیل:۲۳-۲۴)	اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہوکر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ ''پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا''

اس آیت کی تشریح میں علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے:

> ''یہاں خاص طور پر بڑھاپے کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ ایسی حالت ہوتی ہے جس میں والدین اپنے بیٹے کی جانب سے حسن سلوک کے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں، کیوں کہ کم زوری اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کے حالات بدل جاتے ہیں۔ اس لیے اس مرحلہ میں ان کی دیکھ بھال کی پہلے کے مقابلے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اس عمر میں ماں باپ کا انحصار پورے طور پر اپنے بیٹے پر ہوتا ہے، وہ ضرورت مند ہوتے ہیں کہ ان کا بیٹا ان کے

بڑھاپے میں اسی طرح ان کی دیکھ بھال کرے جس طرح اس کے بچپن میں انھوں نے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ آیت میں بڑھاپے کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے بھی کیا گیا ہے، کہ آدمی طویل عرصہ تک کسی کے ساتھ رہتا ہے تو عموماً اس کے وجود کو بوجھ سمجھنے لگتا ہے، اس سے اکتا جاتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر ناگواری ظاہر کرنے لگتا ہے۔ پھر اگر معاملہ بیٹے اور اس کے ماں باپ کا ہو اور بیٹا ایسا ہو جو ناز نخرے میں پلا ہو اور اس کی دین داری میں بھی کمی ہو تو وہ مختلف معاملات میں اپنے ماں باپ پر غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگتا ہے، اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور ان کے ساتھ برتاؤ میں وہ حدِّ ادب کو پھلانگ جاتا ہے''۔[۱۰]

علامہ زمخشریؒ نے آیت کی بلاغت اور اس کے مشتملات کی معنویت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''اس آیت میں لفظ 'عندک' (تمھارے پاس رہیں) کے استعمال میں بڑی معنویت پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی اس عمر کو پہنچ جائیں کہ اپنے روزمرہ کے کاموں کی انجام دہی ان کے بس میں نہ ہو، ان کا انحصار پورے طور پر اپنے بیٹے پر ہو جائے، اس کے علاوہ اور کوئی ان کی کفالت کرنے والا نہ ہو، وہ اس کے پاس، اس کے گھر میں اور اس کی کفالت میں ہوں، یہ صورت حال بسا اوقات بیٹے پر شاق گزرتی ہے۔ اور وہ بہ دقّت اسے برداشت کر پاتا اور اس پر صبر کر پاتا ہے۔ کبھی اسے ان کے ساتھ وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو وہ اس کے ساتھ اس کے بچپن میں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیٹے کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ معاملہ کرنے میں خوش اخلاقی، نرمی اور برداشت کا مظاہرہ کرے، یہاں تک کہ اگر کبھی ان کی جانب سے کسی ایسے فعل کا صدور ہو جائے جس سے اس کی طبیعت اِبا کرتی ہو یا ان کی کفالت سے وہ بار محسوس کرتا ہو تو بھی ان کے سامنے اس پر ادنیٰ سی ناگواری ظاہر نہ کرے۔''[۱۱]

مزید فرماتے ہیں:

''اللہ سبحانہ نے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا بہت تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے۔ اس حکم میں کتنا زور پایا جاتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اس کا تذکرہ اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ کیا ہے۔ اور دونوں احکام ایک ساتھ دیے ہیں۔ پھر ان کے حسنِ معاملہ کے دائرہ کو اور تنگ کر دیا ہے، چنانچہ اگر ماں باپ کے کسی رویّہ یا فعل پر ناگواری کے اسباب ومحرکات موجود ہوں اور واقعی ایسے حالات پائے جائیں کہ صبر اور برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہو، تو بھی بیٹے کو ناگواری کا ایک لفظ منہ سے نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے''۔[۱۲]

ماں باپ کو 'اف' نہ کہنے کا مطلب

بوڑھے ماں باپ کے تعلق سے آیتِ بالا میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ انھیں 'اف' نہ کہو۔ 'اف' سے مراد زبان سے کوئی ایسا لفظ نکالنا ہے جس سے ناگواری کا اظہار ہوتا ہو۔[۱۳] ماہر لغت اصمعی فرماتے ہیں:

''''اف' اصلاً کان کے میل کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی چیز سے گھن ظاہر کرنی ہو۔ پھر اس کا استعمال ہر اس موقع پر ہونے لگا جب کسی چیز پر ناپسندیدگی اور ناگواری کا اظہار کرنا ہو''[۱۴]

امام رازیؒ نے لکھا ہے:

''''اف نہ کہو' یہ ایک تعبیر ہے۔ اسے اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب اذیت پہنچانے والی اور ناگوار معمولی سی بات سے روکنا مقصود ہو۔ اس کے ذریعہ اذیت پہنچانے والی دیگر تمام باتوں اور کاموں سے روک دیا گیا ہے۔ یہ ادنیٰ کے ذریعہ اعلیٰ پر استدلال کے قبیل سے ہے۔ یہ کہہ کر گویا والدین کی انتہائی تعظیم اور ادب کا حکم دیا گیا ہے''[۱۵]

بدزبانی کی ممانعت

اس آیت میں دوسری بات یہ کہی گئی :وَلَاتَنْهَرْهُمَا، یعنی والدین کو جھڑک کر جواب نہ دو۔علامہ زمخشری نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

(ولاتنهرهما) ولاتزجرهما عما يتعاطيانه مما لايعجبک۔[۱۶]

ولاتنهرهما کا مطلب یہ ہے کہ اگر ماں باپ کوئی ایسا کام کریں جو تمھیں پسند نہ ہو تو ان کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو۔

امام رازیؒ نے لفظ 'نھر' کی یہ تشریح کی ہے:

اظهار المخالفة فی القول علی سبيل الردّ عليه و التكذيب له۔[۱۷]

اس کا مطلب ہے کسی بات پر مخالفت کا اظہار، کہ وہ کچھ کہیں تو اسے رد کر دیا جائے اور انھیں جھٹلا دیا جائے۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر نبی ﷺ نے چند ایسے اشخاص کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوٗر رہوں گے۔ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو اپنے ماں باپ کو برا بھلا کہے۔آپؐ نے فرمایا:

لعن الله من لعن والديه۔[۱۸]

اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر جو اپنے والدین پر لعنت کرے۔

نرمی اور ادب سے بات کرنے کا حکم

اس آیت میں والدین کے تعلق سے تیسرا حکم یہ دیا گیا کہ ان سے نرمی، محبت اور ادب کے ساتھ بات کی جائے۔علامہ ابن کثیرؒ نے 'قولاً کریماً' کی یہ تشریح کی ہے:

(قولاً كريماً) ليّناً طيّباً حسناً بتأدب وتوقير وتعظيم۔[۱۹]

قولاً کریما سے مراد یہ ہے کہ ان سے ادب، احترام اور تعظیم کے ساتھ نرم، اچھی اور عمدہ گفتگو کی جائے۔

مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیبؒ نے اسے بڑے عمدہ طریقے سے سمجھایا ہے۔ ان کے ایک شاگرد نے ان سے عرض کیا: حضرت! قرآن میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، سب کا مطلب میں نے سمجھ لیا ہے، لیکن 'وَقُلْ لَهُمَا قَوْلاً كَرِيمًا' سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے؟ یہ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ بہ راہ کرم اس کی وضاحت فرما دیجیے۔ انھوں نے جواب دیا: ''اس کا مطلب اس انداز سے بات کرنا ہے جس طرح ایک خطا کار غلام اپنے تند خو اور درشت مزاج آقا سے بات کرتا ہے''۔[۲۰]

غایت درجہ تعظیم اور احترام کی تاکید

چوتھی بات یہ کہی گئی کہ ان کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کیا جائے، ان کا ہر ممکن خیال رکھا جائے، ان کی غایت درجہ تعظیم کی جائے، ان کے ساتھ احترام سے پیش آیا جائے اور ان کے سامنے تواضع اختیار کی جائے۔ اس کے لیے بڑی بلیغ تعبیر (وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ) اختیار کی گئی ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

هذه استعارة في الشفقة والرحمة بهما والتذلّل لهما تذلّل الرعيّة للامير والعبيد للسَّادة۔[۲۱]

یہ استعارہ ہے اس بات کا کہ ان کے ساتھ شفقت اور رحم و کرم سے پیش آیا جائے اور ان کے سامنے اس طرح جھک کر رہا جائے جس طرح رعایا اپنے حکم راں کے ساتھ اور غلام اپنے آقا کے سامنے رہتے ہیں۔

اس آیت میں جو بلاغت پائی جاتی ہے اس کی وضاحت امام قفّال نے یوں کی ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے والدین کے سامنے انتہائی تواضع اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی کہ ''ان کے سامنے نرمی اور رحم کے پَر جھکا کر رکھو''۔ یہ استعارہ دو پہلوؤں سے ہے۔ اول یہ کہ پرندہ جب اپنے بچوں کو اپنے سے قریب رکھتا ہے تو انھیں اپنے پروں میں سمیٹ لیتا ہے۔ یہ حسنِ انتظام کا کنایہ ہے۔ گویا بیٹے سے کہا گیا کہ اپنے والدین کی کفالت کرو اور انھیں اپنے پاس رکھ کر اس طرح ان کی دیکھ بھال کرو جس طرح انھوں نے تمہارے بچپن میں تمھارا خیال رکھا تھا۔ دوم یہ کہ پرندہ جب اڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے پَر پھیلا لیتا ہے اور جب اڑنا نہیں چاہتا تو اپنے پَر سمیٹے رہتا

ہے۔ گویا پَر جھکا کر رکھنا تواضع اختیار کرنے سے کنایہ ہے‘‘۔۲۲؎

مکمل خدمت گزاری کی تلقین

پانچویں اور آخری بات یہ کہی گئی کہ والدین نے اپنے بیٹے کی، اس کے بچپن میں، پرورش و پرداخت میں جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور مشقتیں جھیلی ہیں، بیٹے کو انھیں یاد رکھنا چاہیے، اسے ان کا سراپا سپاس رہنا چاہیے اور ان کے لیے بارگاہ الٰہی میں دست بہ دعا رہنا چاہیے۔ علامہ قرطبیؒ نے آیت کے ٹکڑے (وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيْراً) کی تشریح میں لکھا ہے:

> ’’اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کریں اور ان کے لیے دعا کرتے رہیں۔ اس نے ہر بندے کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اسی طرح رحم دلی سے پیش آؤ جس طرح وہ تمھارے ساتھ پیش آئے تھے، اسی طرح ان کے ساتھ نرمی برتو جس طرح انھوں نے برتی تھی۔ تم اپنے بچپن میں گم نام اور محتاج تھے، انھوں نے تم کو خود پر ترجیح دی، راتوں میں جاگ جاگ کر تمھاری خدمت کی، خود بھوکے رہ کر تمھیں آسودہ کیا، خود ننگے رہ کر تمھیں کپڑے پہنائے۔ اب تم انھیں اس کا بدلہ اسی صورت میں دے سکتے ہو کہ جب وہ اپنے بڑھاپے میں اس حال کو پہنچ جائیں جس میں تم اپنے بچپن میں تھے تو تم ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرو جیسا انھوں نے تمھارے بچپن میں تمھارے ساتھ کیا تھا۔ اس کے باوجود انھیں سبقت کا شرف حاصل رہے گا‘‘۔۲۳؎

والدین کو خوش رکھنے کی کوشش کی جائے

حقوقِ والدین کے سلسلہ میں قرآن و حدیث میں جو تعلیمات مذکور ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کا ہر حکم بجالایا جائے اور کسی معاملہ میں ان کی مرضی کے خلاف کام نہ کیا جائے، خواہ ان کا حکم طبیعت پر کتنا ہی گراں کیوں نہ ہو اور ان کی مرضی کا کام کرنے میں کتنا ہی نقصان دکھائی دیتا ہو۔

ایک موقع پر حضرت ابوالدرداءؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ان میں سے ایک بات یہ ہے:

واطع والدیک وان امراک ان تخرج من دنیاک فاخرج لھما۔۲۴	اپنے ماں باپ کا کہنا مانو، یہاں تک کہ اگر وہ تمھیں حکم دیں کہ تم اپنی دنیا سے نکل جاؤ تو ان کا کہنا مانتے ہوئے نکل جاؤ۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے چند ایسے اشخاص کا تذکرہ کیا جن کی طرف سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی نگاہ پھیر لے گا اور وہ جنت میں داخلہ سے محروم ہوں گے۔ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو اپنے والدین کا نافرمان ہو۔۲۵

ایک مرتبہ آپؐ نے صحابہ کرام کی ایک مجلس میں ان سے فرمایا: کیا میں تمھیں 'اکبر الکبائر' (سب سے بڑے گناہوں) کے بارے میں نہ بتاؤں؟ پھر آپؐ نے جو چیزیں گنائیں ان میں سے ایک 'والدین کی نافرمانی' تھی۔۲۶

والدین کا کہنا نہ ماننے کی صرف اسی صورت میں اجازت ہے جب وہ کسی ایسے کام کا حکم دیں جو دینی وشرعی اعتبار سے ناجائز ہو۔ان کی وہ بات تو نہیں مانی جائے گی، لیکن دیگر معاملات میں ان کے ساتھ حسب سابق خوش گوار تعلق رکھنا اور اچھا برتاؤ کرنا لازمی ہوگا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلى أَن تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً۔ (لقمان:۱۵)۲۷	لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب مشہور صحابیٔ رسول حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اسلام قبول کرنے پر ان کی ماں نے سخت ناراضی ظاہر کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ جب تک تم اس نئے دین کو چھوڑ نہیں دوگے میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی ۲۸اس کے جواب میں کہا گیا کہ ان کی یہ بات تو نہیں مانی جائے گی، البتہ دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک جاری

رکھنا ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

''یہ آیت دلیل ہے اس بات پر کہ اگر ماں باپ کافر ہوں تو بھی اگر وہ ضرورت مند ہوں تو ان کی مالی مدد کی جائے۔ ان کے ساتھ نرمی سے بات کی جائے اور سہولت کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے''۔۲۹

اولاد اگر والدین کی مرضی کے کام کرے گی اور ان کا کہنا مانے گی تو وہ خوش رہیں گے اور اگر وہ ان کی مخالفت کرے گی اور اس کے کام ان کی مرضی کے خلاف ہوں گے تو انہیں تکلیف اور رنج ہوگا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ والدین کے خوش رہنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ان کی ناراضی اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث بنتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

رضا الرب تبارک وتعالیٰ فی رضا الوالدین، وسخط الله تبارک وتعالیٰ فی سخط الوالدین۔۳۰	والدین کی رضا مندی میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور والدین کی ناراضی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے۔

اسلام میں ہجرت اور جہاد دو ایسے اعمال ہیں جن کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ لیکن والدین کے حقوق کی ادائی سے بے پروا ہوکر اور ان کو ناراض کرکے ان کی انجام دہی کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں آپؐ سے ہجرت پر بیعت کرتا ہوں۔ جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ اس کے والدین زندہ ہیں اور انھیں اس کی جدائی گوارا نہیں ہے، وہ آہ و بکا کر رہے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

ارجع الیهما واضحکهما کما ابکیتهما۔۳۱	ان کے پاس واپس جاؤ، اور جس طرح تم نے انھیں رلایا ہے، اسی طرح انھیں ہنساؤ۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے:

بکاء الوالدین من العقوق والکبائر۔۳۲	بیٹے کا ایسا رویّہ جس کی وجہ سے والدین رونے پر مجبور ہوجائیں، ان کی نافرمانی ہے اور اس کا شمار بڑے گناہوں میں ہوگا۔

والدین کی معاشی ضروریات کی تکمیل

والدین کے حقوق کی ادائی اوران کے ساتھ حسنِ سلوک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی مالی ضروریات پوری کی جائیں اور انھیں محتاجی کی حالت میں نہ چھوڑ دیا جائے۔ عہد نبوی میں لوگوں نے دریافت کیا کہ وہ کیا خرچ کریں اور کس حد تک خرچ کریں؟ اس کے جواب میں مقدار متعین کرنے کے بجائے مدّاتِ صرف کا تذکرہ کر دیا گیا اوران میں سرِ فہرست والدین کو رکھا گیا:

يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُواْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّهَ بِهِ عَلِيْمٌ۔(البقرۃ:۲۱۵)

لوگ پوچھتے ہیں: ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

عموماً آدمی بیوی بچوں کی کفالت میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ والدین پر خرچ کرنے سے اس کا مال کم اور ہاتھ تنگ ہوجائے گا، اس لیے والدین کے ساتھ حسن سلوک اوران کی کفالت کرنے والے کی روزی میں کشادگی کی خوش خبری دی گئی ہے:

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من سرّہ ان یُمَدّلہ فی عمرہ ویُزاد فی رزقہ فلیبرّ والدیہ، ولیصل رحمہ۔۳۳

جو شخص چاہتا ہو کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو اور اس کا رزق بڑھا دیا جائے اسے چاہیے کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے باپ کی شکایت کی: اے اللہ کے رسول، میرے پاس کچھ مال ہے، لیکن میرے بچے بھی ہیں، میرا باپ میرا مال خرچ کرنا چاہتا ہے۔ میں کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا:

انت و مالک لابیک۔۳۴

تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے۔

دوسری روایت میں اس کے ساتھ یہ اضافہ بھی ہے کہ آپؐ نے باپ کو مخاطب کرکے فرمایا:

ان اولادکم من اطیب کسبکم ، کلوا من کسب اولادکم۔۳۵

تمھاری اولاد تمھاری اچھی کمائی میں سے ہے۔ تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھا سکتے ہو۔

بعض سندوں سے یہ حدیث مفصل مروی ہے۔ اس میں ہے کہ بیٹے کی شکایت پر آپؐ نے اس کے باپ کو بلوا بھیجا۔ وہ حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کے سامنے بیٹے کی شکایت بیان کی۔ اس پر اس نے رو رو کر اپنا دکھڑا سنایا کہ جب وہ جوان اور اس کا بیٹا بچہ تھا تو اس نے اسے پال پوس کر بڑا کیا، اس کے لیے مشقتیں جھیلیں، اس پر اپنی کمائی خرچ کی، کیا اب اسے اتنا بھی حق نہیں کہ اس کی کمائی میں سے اپنی ضرورت بھر کا مال لے لے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کی گفتگو سن کر آں حضرت ﷺ بھی آب دیدہ ہو گئے۔[۳۶]

ایک دوسری حدیث ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ ان سے کسی نے دریافت کیا: میری کفالت میں ایک بچہ ہے، کیا میرے لیے اس کے مال میں سے کھانا جائز ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے:

ان من اطیب ما اکل الرجل من کسبه، و ولده من کسبه۔[۳۷]

آدمی کا سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو وہ اپنی کمائی میں سے کھائے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی میں سے ہے۔

علامہ شوکانیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنے بیٹے کے مال میں شریک ہے۔ اس کے لیے اس میں سے لینا جائز ہے، چاہے بیٹا اجازت دے یا نہ دے اور اس کے لیے اس میں اسی طرح تصرّف کرنا جائز ہے جیسے وہ اپنے مال میں کرتا ہے۔ البتہ ضروری ہے کہ وہ اس میں سے بس بہ قدر ضرورت خرچ کرے، بے دردی سے نہ اڑائے''۔[۳۸]

والدین کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے

والدین کے معاملہ میں صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل کر دی جائے اور ان کے مادی تقاضے پورے کر دیے جائیں۔ یوں بھی عمر رسیدہ افراد کی مالی اور مادی ضروریات بہت محدود ہو جاتی ہیں۔ ان کی تو بس یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ان کے پاس کچھ وقت گزارے، ان سے باتیں کرے اور ان کی باتیں سنے، ان سے ہمدردی، اپنائیت اور

محبت کا اظہار کرے، ان کی تکلیفوں کا ازالہ کرے اور انھیں آرام پہنچائے۔ اسلام کی مجموعی تعلیمات سے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اوپر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کا حوالہ آچکا ہے (إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا .....) اس میں لفظ 'عِندَكَ' (تمھارے پاس) سے اشارہ ملتا ہے کہ آدمی کو ایسی تدبیر اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جس سے اس کے والدین اس کے پاس رہیں یا وہ خود ان کے پاس کچھ وقت گزارے۔

اسلامی تعلیمات کے اثرات

والدین کے بارے میں اسلام کی انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ اسلامی تاریخ کے کسی دور میں مسلم معاشرہ میں والدین کے حقوق سے غفلت اور بے اعتنائی نہیں برتی گئی اور مسلم حکم رانی کے کسی دور میں کسی ملک میں بوڑھوں کے عافیت کدے قائم کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ موجودہ زمانے میں بھی عمر رسیدہ افراد کی حالتِ زار کی جو صورت حال عالمی اور ملکی دونوں سطحوں پر نظر آتی ہے اس میں مسلمانوں کا تناسب بہت معمولی ہے۔

ہندوستان میں اولڈ ایج ہومس کے ایک سروے کے مطابق ۱۹۹۵ء میں ہندوستان میں ۵۲۹ ہومس تھے، ان میں سے صرف ایک، کیرلا کے ضلع کوزی کوڈ میں، مسلمانوں کے زیر انتظام تھا، جب کہ ۲۱۶ کا نظم مسیحی ایجنسیاں کر رہی تھیں، جن میں سے ۸۲ صرف کیرلا میں تھے۔ اُس زمانے میں کیرلا میں کل اولڈ ایج ہومس کی تعداد ۱۰۲ تھی۔ اس سروے میں ۳۰۱۵/افراد کو شامل کیا تھا۔ ان میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۲۶ (۱۱ مرد، ۱۵ عورتیں) تھی۔

اسلام اولڈ ایج ہومس کے قیام کا مخالف نہیں ہے

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام اولڈ ایج ہومس کا مخالف ہے اور وہ خدمتِ خلق کے اس کام کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ بسا اوقات ایسے حالات پیش آسکتے ہیں کہ کوئی مرد یا عورت بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے اور وہ بے سہارا ہو۔ لاولد ہونے کی وجہ سے کوئی اس کی کفالت اور خبر گیری کرنے والا نہ ہو، یا اس کی اولاد ہو مگر اس سے الگ کہیں دُور رہتی ہو، یا اس کے پاس ہی ہو،

مگر اپنی نالائقی کی وجہ سے اس کی صحیح دیکھ بھال نہ کرتی ہو، وغیرہ۔ ایسے لاچار، مجبور اور بے سہارا مردوں اور عورتوں کی خبر گیری کرنا، ان کے کام آنا اور ان کے لیے رفاہی ادارے قائم کرنا اسلام کے نزدیک مطلوب اور اس کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

خیر الناس انفعھم للناس۔ [۳۹] لوگوں میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جس سے دوسرے انسانوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

حواشی ومراجع

۱ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل، طبع مصر، ۱۹۷۲ء، ۲/۴۴۴

۲ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب مصر، ۱۹۸۷ء، ۱۰/ ۲۳۷

۳ رازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، ۱۰/۱۵۱-۱۵۲؛ ابن حیان، البحر المحیط

۴ تفسیر ابن کثیر، ۱۰/۱۵۲-۱۵۳

۵ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب من احقّ الناس بحسن الصحبۃ، ۵۹۷۱، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۱-۳

۶ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب الجہاد باذن الابوین، ۳۰۰۴، ۵۹۷۲؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۵، ۶

۷ صحیح مسلم، ۲۵۴۹

۸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۹، ۱۰

۹ بخاری، الادب المفرد، باب من ادرک ابویہ فلم یدخل الجنۃ، ۱۰

۱۰ تفسیر قرطبی، ۱۰/۲۴۱

۱۱ کشاف، ۲/۴۴۴

۱۲ کشاف، حوالہ سابق

۱۳ کشاف، حوالہ سابق، (’افّ‘ صوت یدلّ علی تضجّر) امام قرطبی نے ابو رجاء العطاردی کی یہ تشریح نقل کی ہے: الافّ الکلام القذع الردی الخفی، ویقال لکل مایضجر ویستثقل (تفسیر قرطبی، ۱۰/۲۴۳)

۱۴ تفسیر کبیر، ۱۰/۱۵۴

۱۵ تفسیر کبیر، ۱۰/ ۱۵۵

۱۶ کشاف، ۲/۴۴۴

۱۷ تفسیر کبیر، ۱۰/ ۱۵۵

۱۸ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی،۴۴،۴۵
۱۹ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم،۳/ ۱۳۵۸
۲۰ تفسیر قرطبی،۱۰/۲۴۳
۲۱ تفسیر قرطبی،۱۰/۲۴۳-۲۴۴
۲۲ تفسیر کبیر،۱۰/ ۱۵۶؛ البحر المحیط، ۶/۳۴
۲۳ تفسیر قرطبی،۱۰/۲۴۴
۲۴ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء،۴۰۳۴
۲۵ سنن نسائی، کتاب الزکاۃ، باب المنّان بما اعطی،۲۵۶۲۔ اس کی روایت بزار، حاکم اور ابن حبان نے بھی کی ہے۔علامہ البانی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔
۲۶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر،۲۶۵۴، صحیح مسلم، کتاب الایمان،۱۴۳
۲۷ یہی مضمون العنکبوت: ۸ میں بھی وارد ہوا ہے۔
۲۸ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ،۴۳،۴۴
۲۹ تفسیر قرطبی،۱۴/ ۶۵
۳۰ منذری، الترغیب والترہیب،۲/ ۹۴۶ بہ حوالہ بزار۔ علامہ البانی نے اسے حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔
۳۱ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الرجل یغزو وابواہ کارھان، سنن النسائی،۴۱۶۳، سنن ابن ماجۃ،۲۷۸۲
۳۲ بخاری، الادب المفرد، باب بکاء الوالدین،۳۱
۳۳ مسند احمد
۳۴ سنن ابن ماجۃ، کتاب التجارات، باب مالرجل من مال ولدہ،۲۲۹۱
۳۵ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ،۳۵۳۰؛ سنن نسائی، ۴۴۵۰؛ سنن ابن ماجۃ،۲۲۹۲
۳۶ تفسیر قرطبی
۳۷ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب الرجل یاکل من مال ولدہ، ۳۵۲۸، سنن النسائی، ۴۴۴۹، سنن ابن ماجۃ،۲۲۹۰
۳۸ شوکانی، نیل الاوطار،۵/۳۹۱
۳۹ عبدالرؤف المناوی، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر،۳/۴۸۱

☆☆☆

مولانا مودودیؒ کے معاشی افکار

——————— ڈاکٹر اوصاف احمد

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو سماجی علوم میں معاشیات سے شروع ہی سے دل چسپی رہی ہے۔ انھوں نے اپنے تصنیفی دور کے آغاز ہی میں ایک صحافی کی حیثیت سے ہندوستان کے صنعتی زوال اور اس کے اسباب پر ۱۹۲۴ء میں گفتگو کی اور اس ذیل میں اسلام کی تعلیمات کی طرف بھی اشارے کیے۔ ڈاکٹر اوصاف احمد نے ذیل کے مضمون میں اس تحریر کا اور بعض دوسری تحریروں کا معاشی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ بعد کے دور میں مولانا مودودیؒ نے جب اسلام کو ایک نظامِ حیات کے طور پر پیش کرنا شروع کیا تو مختلف مناسبتوں سے معاشیات کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ مولانا کی ان تمام تحریروں کو محترم پروفیسر خورشید احمد نے 'معاشیاتِ اسلام' کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں کتابی شکل دے دی تھی جسے مولانا مودودیؒ نے پسند کیا تھا اور کہیں کہیں ضروری اصلاحات اور اضافے بھی کیے تھے۔ اس وقت سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ حال میں اس کا انگریزی ترجمہ جناب امام شفیق ہاشمی سینیر ریسرچ فیلو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے First Principles of Islamic Economics کے نام سے کیا ہے۔ اس میں مولانا مودودیؒ کے بعض ان مضامین کا ترجمہ بھی موجود ہے، جو 'معاشیاتِ اسلام' میں شامل نہیں تھے۔ ترجمہ کی خوبی کے لیے اتنی بات کافی سمجھی جائے گی کہ پروفیسر خورشید احمد نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس ترجمہ پر پروفیسر خورشید احمد نے موجودہ معاشی بحران کے پس منظر میں ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس نے کتاب کو اپ ڈیٹ کر دیا ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خورشید صاحب نے مولانا مودودیؒ کے بنیادی افکار کو انگریزی میں منتقل کرنے کے لیے ۱۶ جلدوں پر مشتمل ایک بڑا پروجیکٹ تیار کیا ہے۔ یہ کتاب اسی کا حصہ ہے۔ اس پروجیکٹ کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ڈاکٹر انیس احمد نے لی ہے، جو رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر ہیں۔ (جلال الدین)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صرف اسلامی علوم کے ماہر اور عہد جدید میں احیائے اسلام کے داعی ہی نہ تھے، وہ عہد جدید کے ایک باخبر انسان بھی تھے۔ اگر ایک طرف ان کا رشتہ قرآن پاک، حدیث، تفسیر اور فقہ جیسے اسلامی علوم سے استوار تھا تو دوسری جانب وہ سیاسیات، معاشیات، بنک کاری، سماجیات اور قانون جیسے جدید علوم سے بھی اتنے ہی واقف تھے جتنا کہ عہد جدید کے کسی انسان کو ہونا چاہئے۔ خدائے بخشندہ نے انھیں وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ جس علم میں بھی انھیں دلچسپی محسوس ہوئی اس کی رفعتوں کو چھو لیا۔ فہم وادراک کی وہبی صلاحیتوں کو انھوں نے اپنی محنت شاقہ سے صیقل اور غور وفکر کی وادیوں کو اپنی بصیرتوں سے منور کیا۔ عہد جدید کے انسان کی حیثیت سے اپنے زمانہ کے معاشی مسائل ان کی توجہ کے دائرے سے باہر نہ ہو سکتے تھے۔ آئندہ سطور میں مولانا مودودی کے معاشی افکار پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی، تاہم ابتدائی مرحلہ میں ہی ہمارے لیے مشہور اقتصادی مفکر محمد عمر چھاپرا سے اتفاق کر لینا نامناسب نہ ہوگا جنھوں نے لکھا ہے:

''سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کوئی پیشہ ور ماہر اقتصادیات نہیں تھے، بلکہ بنیادی طور پر وہ ایک مصلح تھے، لہٰذا یہ توقع کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ انھوں نے اقتصادیات کے نظریاتی اور علمی مباحث میں حصہ کیوں نہیں لیا۔ ان کا اصلی مطمحِ نظر اسلامی شریعت کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نوعِ انسانی کو فلاح کے راستہ پر گامزن کرنا تھا، چنانچہ انھوں نے نسلِ انسانی کے مسائل کا تجزیہ کرنے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اُن کا حل پیش کرنے کی کوشش کی''[۱]

مولانا مودودیؒ کی حیات مستعار (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) کا زمانہ بڑی قیامت خیز تبدیلیوں اور اُتھل پتھل کا زمانہ تھا[۲] دو بڑی جنگوں کے علاوہ اس زمانے میں کئی چھوٹی مگر اہم جنگیں ہوئیں، مثلاً کوریا کی لڑائی، ویتنام کی جنگ، برصغیر کی تقسیم، فلسطین کی لڑائی وغیرہ۔ ان جنگوں کے دنیا کی معاشی صورت حال پر دوٗر رس اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے علاوہ یہ زمانہ نوآبادیاتی نظام کے عروج وخاتمہ، اشتراکیت کے قیام وانہدام اور بے مثال صنعتی ترقی کے لیے بھی مشہور ہے۔ عہد جدید میں معاشی مسائل کی طرف جو توجہ ہوئی اس کی بھی اس سے قبل کے زمانوں میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ ہم خواہ چاہیں یا نہ چاہیں لیکن معاشی امور کی جانب ہمیں

توجہ دینی ہی پڑتی ہے۔ نا قابل تصور ہے کہ ایک حساس ذہن کے مالک ہونے کی حیثیت سے مولانا مودودی معاشی مسائل سے غافل رہتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی معاشی موضوع پر ان کا پہلا مضمون ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا جب کہ ان کی عمر فقط ۲۱ سال تھی، اس کا عنوان تھا ''ہندوستان کا صنعتی زوال اور اس کے اسباب''۔[۳]

ہندوستان کا صنعتی زوال (Deindustrialization of India) ہندوستان کی معاشی تاریخ کے مؤرخین کا محبوب موضوع رہا ہے۔ دادا بھائی نوروجی سے لے کر رمیش دت، بی ایم بھاٹیہ اور روی بی سنگھ تک سبھی نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر نوجوان مودودی کو بھی اس موضوع میں کشش محسوس ہوئی۔[۴] تعجب ہے تو اس بات پر کہ مودودی کا اندازِ فکر اور اندازِ تحریر معاشیات کے کسی مؤرخ سے کم نہیں اور انھوں نے کم و بیش انھیں مآخذ سے استفادہ کیا ہے جن کا استعمال کوئی ماہر معاشیات کر سکتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل تک ہندوستان ایک معروف صنعتی ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ یہ تو صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے دوران ہوا کہ اس ملک کی صنعتی حیثیت کو زوال ہوا اور اس کے لیے کمپنی نے شعوری پالیسیاں اختیار کیں۔ ملک کی درآمدی اور برآمدی پالیسیاں بدل دی گئیں۔ ہندوستان سے نہ صرف باہر جانے والی اشیاء پر، بلکہ اُس پیداوار پر بھی محصول عائد کیا گیا جو دیسی بازاروں میں فروخت کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں انگلستان سے درآمد کیے جانے والے سامان پر کوئی محصول عائد نہ کیا جاتا تھا۔ اس لیے ہندوستانی بازاروں میں، ہندوستانی اور انگریزی مال کی قیمتوں میں جان بوجھ کر عدم توازن روا رکھا گیا۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں:

''لارڈ لٹن کے بعد لارڈ وپن کے عہد میں جب امن و امان قائم ہوا تو حکومت ہند کے وزیر مال سر دوانس ہبرنگ (بعد میں لارڈ کرومر) کو جس بات کی سب سے پہلے فکر ہوئی وہ یہ تھی کہ بقیہ محصول درآمد کو بھی منسوخ کر دیں، چنانچہ انھوں نے ۱۸۸۲ء کے بجٹ کو نمک اور شراب کے سوا تمام حفاظتی محصول کے وجود سے پاک کر دیا۔ البتہ جس چیز کو ان کی عنایات میں سے کچھ بھی حصہ پانے کا حق نہ تھا وہ غریب کسان کے مستزاد محاصل تھے جو ۱۸۷۱ء سے اس پر

عائد کیے جا رہے تھے اور جن سے قحط کے زمانہ میں بھی چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ بارہ سال تک یہی حالت رہی۔ اس دوران لارڈ ڈفرن اور لارڈ لینڈون کی غیر معقول فوجی پالیسی نے رپن کے قائم کیے ہوئے مالی توازن کو اس حد تک بگاڑ دیا کہ ۱۸۹۱ء کے بجٹ میں ۲ کروڑ سے زیادہ کا گھاٹا آیا۔ اس کو پورا کرنے کے لیے لارڈ برشل کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی اور اُسے صرف یہ اختیار دیا گیا کہ مزید ٹیکس عائد کرنے کے احکامات پر غور کرے۔ کمیٹی نے مارچ ۱۸۷۴ء میں رپورٹ پیش کی کہ محصول درآمد (Import Duty) دوبارہ عائد کرنے کے سوا کوئی ذریعہ ایسا نہیں جسے اختیار کیا جا سکے..... مگر سوتی کپڑا بدستور معافی کی فہرست میں رہنے دیا گیا..... مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستانی ملوں کی پیداوار پر بھی ۵ فیصدی محصول لگا دیا گیا، تاکہ منکاشائر اور بمبئی دونوں ایک سطح پر آ جائیں۔''[۵]

مقالہ کے آخر میں مولانا مودودی بعض ممالک کا بین الاقوامی موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج سے ۵۰ سال قبل (یعنی ۱۹۲۴ء سے ۵۰ سال قبل) جاپان اپنی تعلیمی، صنعتی حتی کہ زرعی حیثیت سے بھی ہمارے مقابلے میں بہت بہتر ہوا تھا۔ مگر اب وہ اپنی روشن خیال خدمت کی بدولت اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ امریکا اور انگلستان کے بعد دنیا میں کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اب سے ۶۰ سال پہلے جرمنی ہم ہی جیسا ایک زراعتی ملک تھا اور اس کی آبادی میں ۶۵ فی صد باشندے زمین کی قوت نامیہ پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے، مگر کامیاب رہنمائی کا آج ہم یہ نتیجہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ دنیا کے صنعتی ملکوں کی پہلی صف میں ہے۔''

ماہرین معاشیات کی اصل دلچسپی یہ جاننے میں رہی ہے کہ کیا نوآبادیاتی عہد میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کا استحصال کیا اور کیا واقعی ہندوستان سے دولت کا اخراج ہوا۔ معاشیات کی اصطلاح میں یہ تصور نظریہ اخراج (Drain Theory) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ کیا ہندوستان سے لوٹی گئی اس دولت نے دولت برطانیہ کی صنعتی ترقی میں کوئی کردار انجام دیا؟ اس زاویۂ نظر کے تحت معاشی ماہرین کی توجہ اس بات پر رہی کہ وہ اخراج دولت (Economic Drain) کا تخمینہ تیار کریں، پھر اس کا موازنہ برطانیہ میں جمع ہونے والی

نفع کی مقدار سے کریں، تاکہ برطانیہ میں ہونے والے Acculation of Capital میں ہندوستانی معیشت کے استحصال کے کردار کا علمی محاکمہ کیا جا سکے۔

اکثر ماہرینِ معاشیات ہندوستان کے استحصال کے موضوع پر قومیت کے حساب سے بٹے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر برطانوی ماہرین کا خیال ہے کہ برطانوی ہند کی حکومت دوسری حکومتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اور برطانوی حکومت نے ہندوستان کا استحصال نہیں کیا۔ مثلاً ویرا انسٹی Veena Anstey ریاست کی معاشی پالیسیوں کو ملک کی بدحالی سے بری الذمہ قرار دیتی ہیں۔ تقریباً ایسی ہی دلیل کیمبرج اکنامک ہسٹری آف انڈیا کے مولفین نے بھی دی ہے۔ دوسری طرف ہندوستانی مؤرخین دادا بھائی نوروجی، رمیش دت، رجنی پام دت، بی این گنگولی، وی وی بھٹ اور بہت سے دوسرے مؤرخین نے برطانوی حکومت کو استحصال کا مجرم قرار دیا ہے۔

ہندوستان کا نوآبادیاتی استحصال

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کا نوآبادیاتی استحصال کرنے کے لئے کئی ہتھکنڈے اپنائے۔ پہلے تو اس نے ہر جائز و ناجائز طریقے سے ملک کی حکومت ہتھیائی، پھر حکومت کو اپنے منافع کے لئے استعمال کیا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کا سیاسی اقتدار سنبھالا تو ہندوستانی معیشت بنیادی طور پر جاگیردارانہ تھی، لیکن جواہر لال نہرو اور رجنی پام دت کے خیال میں ہندوستان میں صنعتی سماج کے ارتقا اور سرمایہ دارانہ معیشت کے قیام کے پورے امکانات موجود تھے۔ کمپنی نے تجارت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ تجارتی محصول نابرابری کے طور پر لگایا گیا۔ ہندوستانی مصنوعات پر اتنا محصول عائد کیا گیا کہ ہندوستانی تاجروں کے لئے صنعتی پیداوار کرنا گھاٹے کا سودا بن گیا۔ تنگ آ کر انھوں نے زرعی پیداوار کے دامن میں پناہ لی۔

کمپنی نے مال گزاری کو استحصال کا وسیلہ بنایا۔ ۱۷۹۳ء میں جب لارڈ کارنوالس نے بندوبست استمراری کا نظام قایم کیا تو ۳۴ لاکھ پونڈ کی مالیت کا محصول مقرر کیا گیا تھا۔ کمپنی اس محصول کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ نہیں کرتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ مال گزاری تو اس کا عین منافع ہے۔ حکومت سنبھالنے کے صرف چند سال کے اندر ہی یہ 'منافع' صرف بنگال کی

ریاست سے ۴۰ لاکھ پونڈ سالانہ تک پہنچ چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کار بد دیانت، غاصب اور رشوت خور تھے۔ لارڈ کلائیو جیسے گورنر جنرل ایک قلاش کی حیثیت سے ہی ہندوستان وارد ہوئے تھے اور جب وہ یہاں سے واپس گئے تو مالا مال تھے۔ مولانا مودودی نے بھی اعداد و شمار کے ذریعہ محصول کی ناانصافی اور غیر مساوی حیثیت کو اجاگر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ہندوستانی مال کی خوبی کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں ہندوستانی سوتی کپڑے کے ۳ لاکھ ۶۰ ہزار تھان انگلستان گئے۔ یہی حال شکر کا تھا کہ ۱۸۳۱ء میں ۵ لاکھ ۱۹ ہزار بنڈور یڈوٹ شکر انگلستان گئی۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان نے برطانیہ کی ضروریات کے ایک چوتھائی حصہ کو پورا کیا۔ مگر چند سال کے بعد ہی یہ نوبت پہنچ گئی کہ وہ خود ان کی ضرورت کے لئے جاوا اور ماریشش سے کروڑوں روپے کی شکر منگوانے لگا۔'' [۷]

اسلام کے عروج نے اُن تمام ملکوں میں علمی مشاغل اور نئے علوم وفنون کو نئی زندگی بخشی جو اسلام کی آمد سے قبل جاہل معاشروں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ قرآن کے نزول کے بعد نہ صرف یہ کہ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ جیسے دینی علوم رائج ہوئے بلکہ عربوں کے علم اللسان، علم البلاغۃ، علم الکتابۃ، علم الخطبات اور علم الشعر والادب جیسے غیر دینیاتی علوم کو بھی رواج ملا۔ عباسی عہد کے آتے آتے، عرب معاشرہ اتنا تعلیم یافتہ ہو چکا تھا کہ تراجم سے استفادہ کر سکے۔ چنانچہ فلسفہ، منطق، ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور کلیات سے متعلق ہزاروں کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ لیکن بغداد کے سقوط کے وقت اسلامی علوم کا چمکتا سورج گہنا چکا تھا۔ اس وقت بنیادی علوم میں تحقیقی کارناموں کا سلسلہ رک سا گیا اور شرحوں پر شرحیں لکھنے کا رواج پڑا۔ چنانچہ مکھی پر مکھی بٹھائی جانے لگی اور بنیادی اہمیت کے سوالات پس پشت چلے گئے۔

مولانا مودودی علیہ الرحمہ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر مسلم معاشروں اور مسلم ملکوں کو اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرنا ہے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستان اور اس کے قرب و جوار کے ممالک بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو سائنس اور علوم جدیدہ کو از سرنو اپنانا ہوگا۔ اُن کے نزدیک یہ بات واضح تھی کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی ترقی کا راستہ اسلام اور سائنس کے پل صراط سے ہوکر ہی گذرتا ہے۔

اپنی ایک تقریر میں مولانا مودودی نے جدید ثقافت کی بابت مسلم ممالک اور عام مسلمانوں کے رویوں کی وضاحت اس طرح کی ہے:

(۱) پہلا رویّہ تو یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں کو ہی بدل دیا جائے۔ احکام کی اَن دیکھی نہ کی جائے تو کہہ دیا جائے کہ ان کے وہ معنی نہیں جو برسہا برس سے چلے آتے ہیں اور اہل مغرب نے زندگی کو جن اصولوں پر قائم کر دیا ہے وہی اسلامی ہیں۔

(۲) دوسرا رویہ یہ ہے کہ اضطرار کی بنا پر حرام اشیاء اور افعال کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا جائے۔

(۳) تیسرا رویّہ یہ ہے کہ حرام کو حرام کہہ دیا جائے ... مشکل یہ ہے کہ ایک چیز کو حرام بتا دینا کافی نہیں جب تک اس کا بدل نہ بتا دیا جائے۔ ایسا بدل جس سے کاروبار زیست چلتا رہے اور چلتی ہوئی بات کو حرام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ رکوا دیئے جائیں اور یوں ہماری گاڑی زیادہ دیر تک چلتی نہ رہ سکے گی۔''

(۴) چوتھا رویہ یہ ہے کہ احکام الٰہی کو ٹھیک ٹھیک مان کر اپنے معاملات پر ٹھیک ٹھیک انطباق کیا جائے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جائے کہ ایک غلط کام کو ترک کر کے کون سا درست کام اختیار کیا جائے جو قابل عمل بھی ہو اور ہمیں اس قابل بھی بنائے کہ ہم دنیا کی رہ نمائی کر سکیں اور دنیا کے غلط طریقوں کو بدلنے کا کام کامیابی سے کر سکیں۔''[۸]

ذیل میں مولانا مودودیؒ کی دو اہم کتابوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔

سود

حرمت سود اسلامی معیشت کی وجہ جواز ہے۔ مولانا مودودیؒ کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ انھوں نے ایک غیر پیشہ ور ہونے کے باوجود اس مسئلہ کے مالہٗ و ما علیہ پیشہ ورانہ مہارت سے واضح کیے۔ یہ مولانا مودودی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے کسی معذرت کے بغیر حرمت سود کے بارے میں وہ دلائل دیئے کہ امریکا کے حالیہ معاشی بحران کے بعد سودی معیشت کا کردار بھی معرضِ بحث میں آنے لگا ہے۔ قارئین کو یہ یاد دلانا شاید نامناسب نہ ہو کہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے انڈین اکنامک ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسے میں ایک تحقیقی

مضمون پیش کیا تھا جس میں سود کے بارے میں اسلام کی معروف تعلیمات کی وکالت اقتصادی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ مشہور ماہر معاشیات فنڈ لے شیراز بھی اس اجتماع میں موجود تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر قریشی کے اس مضمون کو مذہبی تعصب کا عملی مظاہرہ قرار دیا۔ اس واقعہ کے تیس سال بعد ۱۹۷۰ء کی دہائی میں، جب راقم الحروف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات سے وابستہ تھا، ہمارے ایک ساتھی نے غیر سودی بنک کاری کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا اور ایک مؤقر معاشی مجلّہ کو بھیجا۔ جلد ہی انھیں اس مجلّہ کے مدیر شہیر کا جواب موصول ہوا جس میں مقالہ نگار کی جدت طرازی اور افتادِ طبع کے اقرار کے ساتھ یہ اعتراف بھی موجود تھا کہ مذکورہ بالا مضمون مغربی تہذیب کے لیے کسی افادیت کا حامل نہیں۔ اب ۵۰ سال کے اندر ہی صورتِ حال اس قدر تبدیل ہو چکی ہے کہ تمام مغربی مجلّات اسلامی بنک کاری کے موضوعات پر تحقیقی مضامین نہ صرف آب و تاب سے شائع کرتے ہیں، بلکہ اس کے مختلف مباحث بھی ان کے صفحات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ موقر مغربی اشاعتی ادارے اسلامی معاشیات کے موضوعات پر کتابیں شائع کرتے ہیں۔ نامی گرامی یونیورسٹیاں بھی اسلامی معاشیات اور بنک کاری سے متعلق موضوعات پر تحقیقی ڈگریوں کے قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں۔ بلا شبہ اس گہما گہمی کا ایک سبب مولانا مودودیؒ کی تحریریں بھی ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے پہلی بار یہ واضح کیا کہ اسلام میں بارآور اور غیر بارآور قروض کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ جس طرح مغربی تہذیب میں ڈالر صرف ڈالر ہے اُسی طرح اسلامی تہذیب میں قرض صرف قرض ہے۔ اس کے بارآور یا غیر بارآور ہونے کی دلیل غیر متعلق ہے۔ اسی طرح شرح سود کے زائد یا مناسب ہونے کی دلیل بھی ناقابل قبول ہے۔ سود ہر حال میں سود ہے۔ یہ کہنا بھی زائد بات ہے کہ صرفی مقاصد کے لیے دیے جانے والے سود میں تو ظلم شامل ہے لیکن تجارتی مقاصد کے لیے دیے جانے والے قرض میں ظلم نہیں ہے۔ اسلامی بنک کاری اور تکافل کے بنیادی خطوط بھی مولانا نے اپنی تحریروں میں واضح کیے۔

اسلام اور جدید معاشی نظریات

اس رسالہ کے دیباچہ میں مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں:

''یہ مختصر رسالہ میری کتاب 'سود' کے ان ابواب کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل کتاب

مذکور کے حصہ اوّل و دوم میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن حالات میں یہ دونوں حصے مرتب ہوئے تھے ان کی وجہ سے اس کی ترتیب ناظرین کے لئے خاصی پریشان کن بن گئی''۔

چنانچہ ان تمام ابواب کو، جن کا تعلق معیشت کی عام کارکردگی سے تھا، علیحدہ کر کے مذکورہ رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس میں جن موضوعات سے بحث کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱- موجودہ عمرانی مسائل کا تاریخی پس منظر

۲- جدید نظام سرمایہ داری

۳- سوشلزم اور کمیونزم

۴- ردِّعمل (فاشزم اور نازی ازم)

۵- اسلامی نظامِ معیشت کے بنیادی ارکان

۶- جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل

پہلے باب میں سرمایہ دارانہ نظام کے پیش روؤں، جاگیردارانہ نظام، تحریک اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کے عروج سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں جدید نظام سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں شخصی ملکیت کا حق، آزادیٔ سعی کا حق، محرک منافع، مقابلہ اور مسابقت اور ربابت کا عدم مداخلت کے اصولوں کو شامل کیا گیا ہے۔ سرمایہ داری کی خرابیوں میں آدم اسمتھ کے اس مشہور بیان کا حوالہ دیا گیا ہے:

''کم ہی ایسا ہوتا ہے جب کاروباری لوگ کہیں باہم جمع ہوں اور ان کی صحبت پبلک کے خلاف کسی سازش اور قیمتیں چڑھانے کے لئے کسی قرارداد پر ختم نہ ہو''۔

سوشلزم اور کمیونزم کا بھی اسی انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ مولانا مودودی کا اصل کارنامہ اسلامی معاشی نظام کے بنیادی ارکان کی وضاحت کرنا تھا۔ یہ کارنامہ اس کتاب کے پانچویں اور چھٹے باب میں ملتا ہے۔ اسلامی نظام کے ممتاز ارکان میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے:

۱- اکتساب مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق

۲- مال جمع کرنے (Heording) کی مخالفت

۳- خرچ کرنے کا حکم

۴- نظام زکوٰۃ

۵- قانون وراثت

۶- غنائم اور اموال مغنومہ کی تقسیم

۷- اقتصاد کا حکم

حواشی ومراجع

۱ محمد عمر چھاپرا، اسلامی معاشیات میں مولانا مودودی کی خدمات، سہ ماہی مطالعات، جلد۴، شمارہ۴، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۹ مطابق شوال المکرّم تا ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ، ص ۳۳

۲ بعض اعداد وشمار مہیا کرنے کے لئے میں ڈاکٹر وقار انور کا شکرگزار ہوں۔

۳ یہ رسالہ ہمیں جناب ارشد اجمل (نائب صدر، سہولت مائکروفنانس سوسائٹی) کی عنایت سے دستیاب ہوا۔

۴ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مقالہ سب سے پہلے لکھنؤ کے مشہور جریدہ نگار کی تین قسطوں (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ پہلی قسط میں جناب نیاز فتح پوری (مدیر نگار) نے اپنا نام بہ حیثیت مقالہ نگار دے دیا تھا۔ (ہندوستان کا حتمی زوال اور اس کے اسباب صفحہ:۶) مودودی صاحب کے بیان کے مطابق ''یہ مضمون ان کی برسوں کی محنت و مشقت کا نتیجہ تھا'' بقیہ دونوں قسطیں اُن کے نام سے مدیر شہیر کی اس حرکت پر 'ہمت احتجاج' کے بعد ہی شائع ہوئیں۔ (دیکھئے مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی حصہ دوم، مکتوب نمبر ۲۲۱ بنام عاصم نعمانی)

۵ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ہندوستان کا صنعتی زوال اور اس کے اسباب، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۶۶-۶۵

۶ ایضاً ص ۷۹

۷ ایضاً ص ۴۳

۸ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، بینکنگ اور انشورنس، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۱۰ء ص ۴

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور تفسیر مظہری کا تعارف ڈاکٹر رضوان الدین خاں

ناشر: ادارۂ علم وعمل، ریاضِ رضوان، لال ڈگی، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، صفحات: ۲۵۶، قیمت -/۲۵۰ روپے

ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری/ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جن علمی شخصیات کو شہرت حاصل ہوئی ان میں سے ایک قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۶ء- ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) ہیں۔ موصوف نے تفسیر، حدیث، سیرت، عقائد، فقہ واصول فقہ، تصوف، ردّ روافض اور دیگر موضوعات پر چار درجن سے زائد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے بیش تر فارسی میں اور چند عربی میں ہیں۔ دوسرے ان کی صرف ایک درجن کتابیں زیورطبع سے آراستہ ہوسکیں، بقیہ مخطوطات کی شکل میں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ فقہ حنفی میں ان کی تصنیف 'مالابدّ منہٗ' برسہابرس سے درسِ نظامی میں شامل ہے اور اسے ہندوستان کے طول وعرض میں زبردست مقبولیت حاصل ہے اور بارہا طبع ہوچکی ہے۔ ان کی جس کتاب نے انھیں بین الاقوامی شہرت عطا کی وہ ان کی عربی تفسیر ہے، جس کا نام انھوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء- ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) کے نام پر التفسیر المظہری رکھا تھا۔ سات جلدوں پر مشتمل اس تفسیر کی طباعت کی بارہا کوششیں کی گئیں، لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ آتی رہی، بالآخر ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے دس جلدوں میں اس کی اشاعت ہوئی۔ ساتھ ہی چودہ جلدوں پر مشتمل اس کا اردو ترجمہ بھی مولانا عبدالدائم جلالی کے قلم سے طبع ہوا۔ عربی تفسیر ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء میں پاکستان سے بھی شائع ہوچکی ہے۔

علمی دنیا کی بےتوفیقی یا ناقدری ہی کہی جائے گی کہ اس تفسیر اور صاحب تفسیر کو ان کی اہمیت کے باوجود اب تک مطالعہ وتحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا تھا۔ قابل مبارک باد ہیں زیرنظر کتاب کے مؤلف کہ انھوں نے اس جانب توجہ کی اور ان کی اس تحقیق پر انھیں ۱۹۸۵ء میں شعبۂ دینیات (سنّی) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی جانب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ اب ۲۶ سال کے بعد مولف گرامی کی کوشش اور ذاتی صرفہ سے اس کتاب کے چھپنے کی نوبت آئی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں مصنف نے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔اس ضمن میں ولادت، تعلیم، مشایخ طریقت، عہدۂ قضا، معمولات، اخلاق وعادات، اہل وعیال، تلامذہ، مریدین اور مستفیدین کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔اس کے بعد ان کے چند اہم معاصرین کا تذکرہ کیا ہے۔قاضی صاحب کے بعض سوانح نگاروں نے انھیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کا شاگرد لکھ دیا ہے۔فاضل مصنف نے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ قاضی صاحب شاہ ولی اللہ کے شاگرد نہیں تھے۔شاہ صاحب کے شاگرد مولانا ثناء اللہ سنبھلی (م۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) تھے۔نام کی مماثلت کی وجہ سے لوگوں کو اشتباہ ہوا ہے۔ قاضی صاحب کی تمام تصانیف کی فہرست درج کرنے کے بعد ان میں سے ۳۹ کتابوں کا تعارف کرایا ہے (صرف ان نو کتابوں کا وہ تعارف نہیں کرا سکے ہیں جو انھیں دستیاب نہیں ہوسکیں)۔

آخر میں تفسیر مظہری کا تفصیلی تعارف ہے۔مصنف نے زمانۂ تالیف، مدت تالیف اور مآخذ بیان کرنے کے بعد اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے مطابق اس میں ''صحابہ وتابعین کے تفسیری اقوال اور شان نزول وغیرہ سلف صالحین کی تفاسیر سے نقل کیے گئے ہیں، لغوی تحقیق کی گئی ہے اور نحوی تراکیب بھی بیان کی گئی ہیں۔احادیث اس کثرت سے نقل کی ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی اور سند ومتن کے اعتبار سے ان کی صحت وضعف کو ظاہر کیا ہے۔(اس پہلو سے ان کا موازنہ حافظ ابن کثیرؒ سے کیا جاسکتا ہے) ائمہ اربعہ کے مسالک فقہ مع دلائل بیان کیے گئے ہیں۔قراءات عشرہ متواترہ بھی متعدد آیات کے ذیل میں بیان کی گئی ہیں، بہت سے مقامات پر عالمانہ تحقیق کے بعد حضرات اہل باطن کے طریقے پر آیات کا مطلب عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے'' (ص۹۰-۹۱) مصنف نے ہر ایک کی مثالیں پیش کی ہیں۔

کتاب میں کثرت سے فارسی اقتباسات بلاترجمہ دیے گئے ہیں۔بہتر تھا کہ ان کا اردو ترجمہ بھی درج کیا جاتا۔کتاب کی ضخامت کم کرنا پیش نظر تھا تو صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا۔

حواشی میں مصنف نے ایک جگہ حضرت کعب بن زہیرؓ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''مکہ معظّمہ کا بہت مشہور یہودی شاعر تھا۔اسلام سے متاثر ہوا'' (ص۲۴۴، حاشیہ نمبر۲۵۸) یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔حضرت کعب بن زہیر پہلے یہودی نہیں بلکہ مکہ کے عام افراد کی طرح

عقیدۂ شرک پر قائم تھے اور وہ اسلام سے صرف متاثر نہیں ہوئے، بلکہ انھیں قبولِ اسلام کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ اس طرح کی بعض اور فروگزاشتیں بھی ہوسکتی ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے موضوع پر بھرپور معلومات فراہم کرتی اور مصنف اور کتاب کا عمدہ تعارف کراتی ہے۔ امید ہے علمی حلقوں میں اسے پذیرائی حاصل ہوگی اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بائبل کی چند پیشین گوئیاں عبدالستار غوری

ناشر: المورد، لاہور، ۲۰۱۰ء، صفحات: ۱۵۴، قیمت -/۲۴۰ روپے

قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اہل کتاب آخری رسول حضرت محمد ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو (الانعام: ۲۰) اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی مذہبی کتابوں میں آپؐ کے بارے میں متعدد پیشین گویاں صریح الفاظ میں مذکور ہیں یا واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ علمائے اسلام نے ان پیشین گوئیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور آں حضرت ﷺ کی ذات گرامی کو ان کا مصداق قرار دیا ہے۔ اسی طرح کی چند پیشین گوئیوں کا تذکرہ زیرنظر کتاب میں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مصنف جناب عبدالستار غوری اہل کتاب کی مذہبی کتابوں کا وسیع مطالعہ اور ان پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ ایسی تحقیقات پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں جو علمی دنیا میں پہلی بار منظر عام پر آئی ہیں۔ اس سے قبل انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اس موضوع پر دادِ تحقیق دی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو فرزندوں (حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ) میں سے کون ان کے 'اکلوتے فرزند ذبیح' تھے۔ انھوں نے خود بائبل کے صحیفوں کے متعدد بیانات سے ثابت کیا تھا کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے۔ ان کی ان کتابوں کو علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ اس کے بعد ان کی ایک کتاب Mohammad Foretold in the Bible by Name کے نام سے شائع ہوئی، جس میں انھوں نے ثابت کیا کہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں بائبل میں آپؐ کے نام کی صراحت کے ساتھ پیشین گوئی

موجود ہے۔ زیرنظر کتاب میں مذکورہ انگریزی کتاب کے منتخب حصوں کے ترجمے کے علاوہ کچھ نئے مباحث بھی شامل ہیں۔

کتاب میں چھ پیشین گوئیوں سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے پانچ عہدنامہ قدیم کی ہیں۔ پہلی پیشین گوئی کتاب غزل الغزلات سے لی گئی ہے، جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے آپؐ کے شمائل بیان کیے ہیں۔ دوسری پیشین گوئی میں، جو کتاب استثناء سے ماخوذ ہے، آں حضرت کو 'حضرت موسیٰؑ کی مانند ایک نبی' کہا گیا ہے۔ تیسری پیشین گوئی میں، جو کتاب استثناء ہی کی ہے، آپ کو 'دس ہزار قدّوسیوں کے ساتھ فاران پہاڑ سے جلوہ گر ہونے' کی بات کہی گئی ہے۔ چوتھی پیشین گوئی حضرت یعقوبؑ کی زبانی کتاب پیدائش میں مذکور ہے، جس میں انھوں نے آپؐ کے لیے لفظ 'شیلوہ' استعمال کیا ہے۔ پانچویں پیشین گوئی حضرت داؤد نے زبور میں کی ہے، جس میں انھوں نے آپ کو 'ابدی ممدوح الامم' قرار دیا ہے۔ چھٹی پیشین گوئی (جس سے مصنف نے کتاب کے چوتھے باب میں بحث کی ہے) یہود کے ایک مذہبی صحیفے 'صعود موسیٰ' (جسے حضرت عیسیٰؑ کی بعثت سے کچھ عرصہ پہلے ضبط تحریر میں لایا گیا تھا) سے لی گئی ہے۔ ان پیشین گوئیوں کو نقل کر کے فاضل مصنف نے ان پر تفصیل سے بحث کی ہے اور بائبل کے مختلف زبانوں میں تراجم، شروح، لغات اور یہود کے نزدیک معتبر دیگر کتب کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں حرف بہ حرف خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ پر صادق آتی ہیں۔ اور یہ آپؐ کے آخری رسول ہونے کی محکم دلیل ہے۔

تقابل ادیان کے موضوع پر یہ ایک عمدہ تصنیف ہے، جس میں اعلیٰ تحقیقی معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے مصنف کے الفاظ میں ''محمد رسول اللہ ﷺ پر شعوری ایمان مضبوط ہوگا اور آپؐ کی نبوت کی ایک محکم دلیل سے آشنائی ہوگی'' (ص xii)۔ (م-ر)

بررسی ادبیات امروز ایران پروفیسر محمد استعلامی، مترجم: ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

ناشر: گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ باکس نمبر:۱۱۴، علی گڑھ، صفحات:۳۵۲، قیمت:۱۶۴ روپے

زیرتبصرہ کتاب کے مصنف پروفیسر محمد استعلامی میک گل یونی ورسٹی، کینیڈا سے

وابستہ ہیں۔ہم عصر ایرانی ادب کی تاریخ پر مشتمل ان کی یہ کتاب مختصر، جامع اور اہمیت کی حامل ہے، جو ایرانی کالجوں کے طلبہ کی نصابی ضرورتوں کے تحت تحریر کی گئی تھی۔اس کتاب کے مترجم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ایس،ٹی ،ہائی اسکول میں فارسی کے استاد، فارسی زبان وادب کے عالم اور اس زبان کے معروف شاعر ہیں۔حال ہی میں ان کے فارسی کلام کا دوسرا مجموعہ ُ سرمۂ اعتبار ُ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔مقدمے میں فارسی زبان کی تین ہزار سالہ تاریخ کو مختصراً سمونے کی کوشش کی گئی ہے، جس کے تحت ُ آغاز سے لے کر عہد غزنوی، عہد سلجوقی ،عہد مغول، عہد صفوی، عہد بازگشت وغیرہ میں ادب کی صورت حال کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔باب اول تیرہویں صدی ہجری کے ایران میں ترقیات یوروپ کے زیر اثر نئی فکر اور نئی روشنی کی راہ ہموار کرنے والے زعماء، اہل علم، جدید دانش گاہوں، چھاپا خانوں، اخبارات اور ان کے بانیان اور مصنفینِ کتب کے بارے میں اجمالی معلومات فراہم کرتا ہے۔باب دوم ُ فارسی زبان میں سادہ نویسی کا رجحان ُ میں کچھ سرکردہ سادہ نویسوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کی تحریروں سے نمونے پیش کیے گیے ہیں۔اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ فارسی زبان میں سادہ نگاری کا اظہار سب سے پہلے گیارہویں ہجری کے ابتدائی برسوں میں مغل بادشاہ اکبر اعظم (۹۶۳۔۱۰۱۴) کے وزیر ابوالفضل کی زبان سے ہوا۔(ص ۶۹)

باب سوم ُ زمانۂ انقلاب کی فارسی نثر ُ میں ان اہل قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھوں نے چودھویں صدی ہجری کے ابتدائی برسوں میں اپنی تصنیفات کے ذریعہ ایرانی عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔اس میں تین اہل قلم: زین العابدین مراغہ ای،عبدالرحیم طالب زادہ اور علی اکبر دہخدا کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کو پیش کیا گیا ہے اور ان کی تخلیقات کے نمونے نقل کیے گیے ہیں۔چوتھا باب داستان نویسی پر ہے،جس میں دیگر داستان نویسوں کے علاوہ محمد علی جمال زادہ، صادق ہدایت، جلال آل احمد، محمد حجازی، صادق چوبک اور علی محمد افغانی کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اور ان کے امتیازات موثر تنقیدی پیرایے میں بیان کرتے ہوئے اقتباسات کے نمونے بھی پیش

کیے ہیں۔مصنف نے لکھا ہے کہ فارسی میں ناول نگاری کا آغاز تاریخی ناولوں سے ہوا اور فارسی کا دوسرا تاریخی ناول ۱۳۳۹ھ میں بمبئی سے 'دام گسترن یا انتقام خواہان مزدک' کے نام سے شائع ہوا، جس کا مصنف صنعتی زادہ کرمانی تھا۔(ص ۱۶۸)

پانچویں باب 'معاصر ایرانی شاعری اور اس کی قدر شناسی کے لیے ایک خاکہ' میں مصنف نے، شاعری کیا ہے؟ قدیم ہیئتوں میں احساسات و جذبات کے اظہار کی دشواریاں، عہد حاضر کی شاعری میں ہیئتوں کی تبدیلی اور آزادی میں نئے پن کی نوعیت، آج کے شاعروں کی طبقہ بندی کس طرح کی جائے؟ شعر نو اور موج نو کیا ہے؟ اور آج کی شاعری کی ضروریات و مطالبات، کے عنوانات کے تحت عمدہ اور نفیس فنی گفتگو کی ہے۔اس کتاب کا چھٹا باب ڈرامے کے فن اور ایران میں ڈراما نگاری پر مشتمل ہے۔ساتویں باب 'ادبیات اور نظری علوم میں تحقیق' میں جن ایرانی محققین اور ان کے تحقیقاتی کارناموں کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں محمد قزوینی، استاد فیروز انفر، سعید نفیسی، احمد کسروی، ڈاکٹر محمد معین اور ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری شامل ہیں۔آٹھواں باب بچوں اور نوجوانوں کے ادب کے مطالعے پر مشتمل ہے، جس میں محمد باقر ہوشیار، فضل اللہ صبحی مہتدی، صادق ہدایت، عباس نیمی شریف اور صمد بہرنگی کی تخلیقات کا تعارف، نقد اور عبارت کے نمونے شامل ہیں۔آخر میں بطور ضمیمہ مصنف کی ایک دوسری کتاب 'ادبیات دورہ و بیداری معاصر' کے مقدمے کا ترجمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

اردو کتابوں کی اغلاط کی روایت کے مطابق اس میں بھی کتابت کی غلطیاں ہیں، اگرچہ کافی کم ہیں۔ضرورت تھی کہ کتاب کے نام کا بھی عام فہم اردو میں ترجمہ کر دیا جاتا۔

بحیثیت مجموعی زیر تبصرہ کتاب اپنے موضوع پر مختصر ہونے کے باوجود جامع اور منفرد ہے۔اس کے ذریعہ، ہم عصر ایرانی ادب کی اجمالی تاریخ ہمارے سامنے آتی ہے۔اس کی نثر میں علمیت، وضاحت، سادگی، دل کشی، بے تکلفی اور روانی پائی جاتی ہے اور مترجم نے اس کے مذکورہ خصائص کو بہ طریق احسن برقرار رکھا ہے۔مصنف اور مترجم دونوں کی کوشش لائق قدر ہے۔ (محمد شہاب الدین)

اشاریۂ معارف (جولائی ۱۹۱۶-دسمبر ۲۰۱۱ء) مرتب: جمشید احمد ندوی

ناشر: دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء، صفحات: ۷۲۳ (بڑی تقطیع) قیمت -/۸۵۰ روپے

ماہ نامہ 'معارف' اعظم گڑھ کو ہندو پاک کے اردو رسائل کی تاریخ میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں اجراء کے بعد سے اب تک ۹۵ سال سے زائد عرصہ سے یہ پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ اس اعتبار سے اس نے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین کا علمی معیار اور تحقیقی انداز مسلّم ہے۔ اس کے مشتملات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں تفسیر وعلوم قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، اسلامی تاریخ، فلسفہ وعلم کلام، تصوف، ادب وشاعری، سماجیات، معاشیات، سیاسیات، شخصیات، فنون لطیفہ اور عصری علوم جیسے موضوعات شامل ہیں۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ اردو اشاریہ سازی کے فن کو فروغ ملا اور رسائل کے اشاریے تیار کیے جانے لگے تو اس فن سے دل چسپی رکھنے والے متعدد حضرات نے معارف کا اشاریہ تیار کرنے کی طرف توجہ کی۔ مختلف اوقات میں اب تک اس کے پانچ اشاریے تیار کیے جاچکے ہیں۔ ان میں آخری اشاریہ ڈاکٹر سہیل شفیق اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ کراچی یونی ورسٹی کا تیار کردہ ہے، جس میں ۲۰۰۵ء تک کے مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اب زیر نظر اشاریہ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، ریسرچ ایسوسی ایٹ شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے خود دارالمصنفین اعظم گڑھ کی سرپرستی میں تیار کیا ہے۔ اس میں دسمبر ۲۰۱۱ء تک کے مضامین شامل ہیں۔

اس اشاریہ کی تیاری کا آغاز فاضل مرتب نے ۱۹۹۵ء میں پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی نگرانی میں کیا تھا۔ مختلف رکاوٹوں کی وجہ سے اس کی تکمیل میں تاخیر ہوتی رہی۔ ۲۰۰۰ء تک کے مضامین کا تیار کردہ اشاریہ ۲۰۰۴ء میں پریس جانے ہی والا تھا کہ کسی وجہ سے پھر رکاوٹ آگئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اس میں مزید گیارہ سال کے مضامین شامل کرلیے گئے ہیں۔

مرتب نے اشاریہ کو تین جلدوں میں تیار کیا ہے۔ یہ اس کی جلد اول ہے، جسے باعتبار عناوین مرتب کیا ہے۔ دوسری جلد باعتبار مضمون نگاران اور تیسری جلد باعتبار موضوعات

ہوگی۔ یہ جلدیں آئندہ شائع ہوں گی۔ مرتب نے اپنی تقدیم میں تفصیل سے اشاریہ کی تیاری کے مختلف مراحل کی روداد، مجلّہ معارف کی خصوصیات وامتیازات، اس کے مختلف کالموں کے خدو خال اور اشاریہ سے استفادہ کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے۔

اشاریہ کی تیاری کا جو طریقہ مروج ہے وہ یہ کہ مضامین کی فہرست سازی موضوعات کے اعتبار سے کی جاتی ہے اور ان مضامین کے نمبر شمار مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ بعد میں مضمون نگاروں اور عناوین کے اعتبار سے اشاریہ تیار کرتے وقت صرف وہ نمبر درج کر دیے جاتے ہیں۔ فاضل مرتب نے اس کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ تینوں اعتبار سے اشاریہ مرتب کرتے وقت ہر جگہ معلومات کا مکمل اندراج کیا ہے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ ''مروجہ طریقہ اختیار کرنے کی صورت میں کسی خاص مضمون نگار کے مضامین تلاش کرنے میں قاری کو بار بار اشاریہ کے اوراق الٹنے پلٹنے کی زحمت ہوتی'' (ص ۲۷) ہر جگہ مکمل اندراج سے یہ زحمت تو نہیں ہوگی، لیکن مروج طریقہ سے جو کام ایک جلد میں ہو جاتا وہ اس طریقہ سے تین جلدوں میں پورا ہوگا۔ اس سے مرتب کو ترتیب کی زحمت اور ناشر کو طباعت کے مصارف کی زحمت ہوئی ہے اور اشاریہ سے دل چسپی رکھنے والوں کو تین ضخیم جلدوں کی خریداری کے لیے گراں بار مصارف کی زحمت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

بہ ہر حال فاضل مرتب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے بہت محنت سے ایک قابل ستائش علمی خدمت انجام دی ہے اور دیر سے سہی معارف کا مکمل اشاریہ منظر عام پر آیا ہے۔ امید ہے بقیہ دونوں جلدیں بھی جلد شائع ہوں گی۔ (م-ر)

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (O)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۴۴)

☆ صدر ادارہ و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے جون ۲۰۱۲ء کے دوسرے ہفتے (۶/تا ۱۳/جون) میں پڑوسی ملک پاکستان کا دورہ کیا۔ اس دورہ میں معاون مدیر تحقیقات اسلامی وسکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ سفر اصلاً جماعت اسلامی کراچی کے ادارۂ نورحق کے زیر اہتمام منعقدہ بین الاقوامی قرآن نمائش (۸ تا ۱۰/جون ۲۰۱۲ء) کی افتتاحی تقریب میں بہ طور مہمان خصوصی شرکت کے لیے ہوا تھا۔ اس موقع پر نمائش کے منتظمین نے مولانا عمری کے کوائف اور علمی خدمات کے تعارف پر مشتمل ایک قدیم تحریر کو، جسے ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے تیار کیا تھا، کتابچہ کی شکل میں شائع کر کے نمائش دیکھنے کے لیے آنے والوں اور دوسرے لوگوں میں بڑے پیمانے پر تقسیم کیا۔ کراچی کے علاوہ مولانا لاہور، حیدرآباد اور اسلام آباد بھی تشریف لے گئے۔ وہاں ان کے اعزاز میں بڑے استقبالیہ پروگرام منعقد کیے گئے اور انھوں نے تحریکی اور عوامی اجتماعات میں خطابات کیے۔ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے صدر ڈاکٹر ممتاز احمد نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی، ان کی خدمت میں یونی ورسٹی کا مومنٹو پیش کیا اور ظہرانہ دیا۔ (اس سفر کی روداد ڈاکٹر ندوی کے قلم سے سہ روزہ دعوت نئی دہلی کے ۲۵/جون تا ۱۰/جولائی ۲۰۱۲ء کے شماروں میں شائع ہوئی ہے)۔ پاکستان کے سفر میں مولانا کے خطابات کی تسوید وتدوین کا کام جاری ہے۔ بہت جلد ان شاء اللہ ان کا مجموعہ شائع کیا جائے گا۔

☆ مولانا عمری کے کتابچہ 'فقہی اختلافات کی حقیقت' کے دو ایڈیشن اس سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ مصنف کی نظر ثانی اور اضافہ کے بعد اب اس کا تیسرا ایڈیشن بھی آ گیا ہے۔ صفحات: ۲۴، قیمت -/۱۵۔ اس کے تمل ترجمہ کے بھی دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

☆ مولانا کا ایک کتابچہ 'دولت میں خدا اور بندوں کا حق' عرصہ سے شائع ہو رہا ہے اور اس کے کئی ایڈیشن آ چکے ہیں۔ حال میں ان کی نظر ثانی کے بعد اس کا نیا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے۔ صفحات: ۲۲، قیمت -/۱۲ روپے۔

☆ خدمت خلق کے موضوع پر مولانا عمری کی مشہور عام تحقیقی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' کے علاوہ ان کا ایک کتابچہ 'انسانوں کی خدمت- اسلام کی نظر میں' عرصہ سے شائع

ہورہا ہے۔اب اس کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے۔صفحات:۲۴، قیمت-/۱۲روپے۔

☆ رکن ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی کی کتاب 'جرائم اور اسلام' کو الحمد للہ علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔اس کے مراٹھی ترجمہ کے بعد اب اس کا ہندی ترجمہ بھی 'بڑھتا اپرادھ-سمسّیا اور ندان' کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوگیا ہے۔صفحات: ۱۹۲، قیمت-/۷۰روپے۔

☆ بہی خواہانِ ادارہ کے لیے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ مولانا ضمیر الحسن فلاحی سابق استاد جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ ورکن اسلامی اکیڈمی علی گڑھ نے بہ حیثیت رکن ادارہ جوائن کرلیا ہے۔اسی طرح ادارہ کے دوسالہ تصنیفی تربیت کورس سے فائدہ اٹھانے والوں میں ایک نئے اسکالرمولانا ندیم الحق عمری کا اضافہ ہوا ہے۔

☆ ادارہ کے سلسلۂ توسیعی خطبات کے تحت پروفیسر سید احتشام احمد ندوی سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، کالی کٹ یونی ورسٹی نے ۹/ جون ۲۰۱۲ء کو 'ملیشیا میں حزب اسلامی کا ارتقاء-موانع ومشکلات' کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کیا۔پروگرام کی صدارت پروفیسر محمد ادریس، صدر شعبۂ کیمیکل انجینیرنگ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے فرمائی۔علی گڑھ کے اہل علم خواتین و حضرات کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

☆ صدرادارہ مولانا عمری ۲۶/ جون ۲۰۱۲ء کو علی گڑھ تشریف لائے۔اس موقع پر آپ کا ایک خطاب عام ہوا۔اس میں انھوں نے فرمایا کہ علم وتحقیق کے میدان میں بالعموم روایتی موضوعات پر کام ہوتا ہے۔ضرورت ہے کہ اسلام کو موجودہ دور کے متبادل کے طور پر پیش کیا جائے۔اس کی طرف اہل علم کی توجہ ہونی چاہیے۔کارکنان ادارہ کے ساتھ بھی مولانا کی نشست ہوئی۔آپ کی آمد کا مقصد ادارہ سے متصل ۳۷۰ گز کے ایک قطعہ آراضی کی خریداری تھی۔الحمدللہ اس کی رجسٹری ہوگئی ہے۔اس کے علاوہ ادارہ کی موجودہ عمارت کی پہلی منزل پر کچھ تعمیری کام جاری ہے۔اس کے نتیجے میں ادارہ مالی اعتبار سے کافی گراں بار ہوگیا ہے۔بہی خواہانِ ادارہ سے درخواست ہے کہ اس کا فیاضانہ مالی تعاون فرمائیں۔اکاؤنٹ کی تفصیل درج ذیل ہے:

IDARA-E-TAHQEEQ-O-TASNEEF-E-ISLAMI

A/C No: 1214740843, CENTRAL BANK OF INDIA,
DODHPUR BRANCH, CIVIL LINES, ALIGARH-202001

R.No. 38933/81 Quartely Mob. 09897655171
Tuhqeeqat-e-Islami Phone: 0571-2902034
July.....2012 Aligarh September.....2012

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۴۰/	۲۰	دولت میں خدا کا حق	۱۰/
۲	اسلام-انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/	۲۱	انفاق فی سبیل اللہ	۳۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۲	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۴	کم زور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/-۳۵/	۲۳	اسلام اور مشکلات حیات	۲۰/۲۵
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۰۰/	۲۴	خدا کی غلامی-انسان کی معراج	۱۰/
۶	خدا اور رسول کا تصور-اسلامی تعلیمات میں	۸۰/	۲۵	اسلام اور وحدت بنی آدم	۶/
۷	معروف و منکر	۸۵/	۲۶	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۸	اسلام کی دعوت	۱۴۰/	۲۷	انسانوں کی خدمت-اسلام کی نظر میں	۱۰/
۹	اسلام-ایک دین کی دعوت	۸/	۲۸	جماعت اسلامی ہند-پس منظر خدمات اور طریقۂ کار	۱۵/
۱۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت-اہمیت اور تقاضے	۵/	۲۹	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۶/
۱۱	دعوت و تربیت-اسلام کا نقطۂ نظر	۵۰/	۳۰	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۰/
۱۲	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۲/	۳۱	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۳	عورت-اسلامی معاشرے میں	۱۶۰/	۳۲	وقت حساب	۱۰/
۱۱۴	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۸۰/	۳۳	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچائیے	۱۰/
۱۵	عورت اور اسلام	۶۰/۴۵/	۳۴	اسلام کا شورائی نظام	
۱۶	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۱۵/	۳۵	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۰/
۱۷	اسلام کا عائلی نظام	۸۵/	۳۶	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۲/
۱۸	بچے اور اسلام	۵/	۳۷	سوئے حرم چلا	۱۵/
۱۹	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۸	دینی علوم کی تدریس	۱۲/

ملنے کے پتے:

۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نیو کیمپس، بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ ۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵